قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

مارچ 982

اس پرچہ میں :-

۱ - قرآن کی بات نہ کرو -

۲ - اسلامی نظام حکومت کیسا ہو گا -

۳ - نظریہ پاکستان کیا ہے ؟

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵ بی - گلبرگ - ۲

قیمت فی پرچہ 3 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ — لاہور

بدلِ اشتراک
سالانہ
پاکستان -/۳۶ روپے
غیر ممالک -/۸۶ روپے

ٹیلی فون نمبر
۸۰۸۰۰
خط و کتابت
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

قیمت فی پرچہ
۳
تین روپے

جلد ۳۵ — مارچ ۱۹۸۲ء — شمارہ ۳

فہرست

۱۔ لمعات ۔۔۔ (نظریہ پاکستان کیا ہے؟) ۔۔۔ ۲
۲۔ فرقے کیسے مٹ سکتے ہیں؟ ۔۔۔ ۱۰
۳۔ "شاہکارِ رسالت" کا تازہ ایڈیشن ۔۔۔ ۲۶
۴۔ قرآن کا نام نہ لو! ۔۔۔ ۲۷
۵۔ رابطہ باہمی ۔۔۔ ۳۹
۶۔ قرآنی درس کے اعلانات ۔۔۔ ۴۰
۷۔ اسلامی نظامِ حکومت کس قسم کا ہوگا؟ ۔۔۔ (محترم پرویز صاحب) ۔۔۔ ۴۱
۸۔ طلوعِ اسلام کا مسلک و مقصد ۔۔۔ ۶۱
۹۔ ادارہ کی کتابوں کی تازہ فہرست ۔۔۔ ۶۳

ایڈیٹر محمد خلیل ۔ ناشر شیخ عبدالحمید ۔ مقامِ اشاعت ۔ ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور ۔ مطبوعہ: اشرف پرنٹنگ پریس ۹ رایبک روڈ ۔ لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

(۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی یاد میں)

یہ عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ ہمارے ہاں موسمِ بہار کی آمد کے ساتھ ہی، ہماری ملّی تاریخ کی دو اہم تقاریب منانے کے دن آ جاتے ہیں۔ بہار کا موسم وہ ہے جس میں کائنات کے گوشے گوشے میں نئی زندگی کی نمود ہوتی ہے۔ شجرِ حیات کی ہر شاخ سے، حسنِ خوابیدہ انگڑائیاں لے کر بیدار ہوتا ہے۔ چٹیل میدانوں میں سبزۂ نورستہ اور خشک ٹہنیوں سے گلِ نودمیدہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھتا ہے اور ہر دیدۂ بینا سے پکار پکار کر کہتا ہے کہ..... فَانۡظُرۡ اِلٰۤی اٰثٰرِ رَحۡمَتِ اللّٰہِ کَیۡفَ یُحۡیِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِہَا ....(۳۰/۵۰) "تم مبدأ فیض کی نیساں باریوں اور گہر فشانیوں کو دیکھو کہ اس نے کس طرح زمینِ مردہ کو حیاتِ تازہ عطا کر دی"۔ موسمِ بہار کی انہی حیات بخشیوں میں ہمارے سامنے ۲۳ مارچ کا وہ یومِ سعید آتا ہے جب قوم کے قلوبِ مردہ میں ولولۂ تازہ کے آثار نمودار ہوئے اور اس نے حصولِ آزادی کے عزمِ جواں بخت کا طنطنہ خیز اعلان کیا۔ اور اس کے بعد ۲۱ اپریل کا وہ دن جب اس ولولۂ تازہ کا پیامبر، اپنا مشن پورا کر کے، اپنے سفر کی اگلی منزل کی طرف روانہ ہوا۔ ان تقاریب کی عظمت و اہمیت کا تقاضا تھا کہ انہیں فلک بوس جوش و خروش اور عالمگیر شان و شکوہ سے منایا جاتا، لیکن جس قوم پر صدیوں سے جمود و تعطّل چھا رہا ہو، ان کے ہاں ہر حیات بخش عمل محض رسم بن کر رہ جاتا ہے۔ آپ غور کیجئے کہ ہمارے دین کے ایسے انقلاب آفریں عناصر ــــــ صوم و صلوٰۃ اور حج و زکوٰۃ وغیرہ ــــــ جنہوں نے انسانیت کے عروقِ مردہ میں خونِ زندگی دوڑا دیا تھا، کس طرح بے روح رسومات کا مجموعہ بن چکے ہیں۔ ان اعمالِ حیات کو بھی چھوڑیئے، وہ کتابِ عظیم جس نے ان کی زندگی کے ہر گوشے میں قندیلِ راہ بننا تھا کس طرح محض الفاظ کا کاغذی پیکر بن چکی ہے۔ دنیا کی کوئی کتاب اس التزام و تکرار و اصرار سے نہیں پڑھی جاتی جس طرح اس کتاب کی تلاوت ہوتی ہے، اور اس کے ساتھ ہی یہ الم انگیز حقیقت بھی ہمارے سامنے ہے کہ دنیا میں یہی ایک ایسی کتاب ہے جس کے الفاظ تو اس طرح دہرائے جائیں لیکن ان میں سے کسی لفظ کے معنی معلوم نہ ہوں۔ لاکھوں کروڑوں گھروں میں اس کی روزانہ تلاوت سے قطعِ نظر، ہزاروں، لاکھوں کے مجمع میں اسے ایک ایک رات میں اس طرح ختم کیا جاتا ہے کہ نہ پڑھنے والا اس کا ایک لفظ سمجھتا ہے، نہ سننے والے ــــــ اور تراویحوں اور شبینوں

کے علاوہ، اب تو گھر گھر قادیوں کے کیسٹ سنائی دیتے ہیں۔ ناظرہ قرآن پڑھانے اور قرأت و تجوید کی تعلیم دینے والے لاکھوں مکاتب کھلے ہیں جن میں اس کے الفاظ کی ادائیگی کے طور طریق سکھائے جاتے ہیں لیکن یہ کسی کو نہیں بتایا جاتا کہ ان الفاظ کے معانی اور مفہوم کیا ہے۔ جو قوم، اس قسم کی کتابِ عظیم کے ساتھ یہ کچھ کر رہی ہو، وہ اگر اپنی ملّی یادگاروں کو محض رسمی طور پر منائے تو اس میں تعجب کی کونسی بات ہے؛ یہ بھی کچھ کم غنیمت نہیں کہ انہوں نے ابھی ان یادگاروں کو یکسر فراموش نہیں کر دیا!

جس طرح، ہماری معاشرتی (اور مذہبی) زندگی میں جس لفظ کو سب سے زیادہ دہرایا جاتا ہے، وہ اسلام ہے۔ لیکن آپ کسی سے پوچھ کر دیکھ لیجئے، اس کے ذہن میں اسلام کا کوئی متعیّن مفہوم نہیں ہوگا۔ اس طرح ہماری سیاسی زندگی میں (پاکستان کے حوالے سے) جن الفاظ کی سب سے زیادہ تکرار ہوتی ہے وہ "نظریۂ پاکستان" ہیں۔ اور لفظ اسلام کی طرح، نظریۂ پاکستان کے متعلق بھی کسی سے پوچھئے۔ وہ بتا نہیں سکے گا کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ ہم آج کی نشست میں، اسی "معمہ" کو لیتے ہیں۔

(٠)

انسان اور حیوان میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ انسان کو قوّتِ گویائی عطا کی گئی ہے۔ وہ اپنے مقصد کا اظہار الفاظ میں کر سکتا ہے۔ وَعَلَّمَهُ الْبَيَانَ۔ خود خدا کا ارشاد ہے۔ انسان کی تمدنی زندگی کا دار و مدار اسی خصوصیت پر ہے۔ لیکن یہ خصوصیت اسی صورت میں نعمت ہے کہ ہم جو لفظ بولیں، سننے والوں کے ذہن میں اس کا مفہوم متعیّن ہو۔ اگر ایسا نہ ہو، اور مختلف افراد ایک ہی لفظ کے معانی مختلف لیں، تو اس سے زندگی اجیرن ہو جائے۔ مثلاً آپ اس ماجرا پر غور فرمائیں کہ آپ نیم بے ہوشی کے عالم میں، شدّتِ پیاس سے کہیں ـــــ پانی ... اور آپ کے گھر والوں میں سے کوئی ماچس کی ڈبیہ لئے چلا آ رہا ہو اور کوئی چمچہ ـــــ ایک آپ کے سرہانے تونیہ لئے کھڑا ہو اور دوسرا بالٹی۔ کسی کے ہاتھ میں تیل کی شیشی ہو اور کوئی آپ کا جوتا تلاش کر رہا ہو ـــــ سوچئے کہ اگر صورت یہ ہو تو خدا کی یہ نعمت (قوّتِ گویائی) کس قدر عذاب بن جاتے! یہ نعمت اسی صورت میں قرار پائے گی، جب آپ "پانی" کہیں تو ہر سننے والا اس سے "پانی" مراد لے۔

یہ مثال تو زندگی کے عام معمولات سے متعلق ہے۔ اسے ذرا آگے بڑھایئے اور سوچئے کہ آپ اہم مسائلِ حیات کے متعلق جو الفاظ یا اصطلاحات استعمال کریں، اگر سننے والوں کے نزدیک ان کا متعیّن مفہوم نہ ہو، تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اسے سمجھنے کے لئے آپ خود اپنی تاریخ پر ایک نظر ڈالیئے۔ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے ایک نظامِ حیات پیش کیا جسے اِسلام کی اصطلاح سے تعبیر کیا۔ اس کا مفہوم اس قدر واضح اور متعیّن تھا کہ موافق، مخالف، ہر ایک سمجھتا تھا کہ اس سے مراد کیا ہے۔ لیکن اس سے ذرا آگے چل کر ہمارے سامنے یہ نقشہ آتا ہے کہ ہر شخص کی زبان پر اسلام ہے لیکن ہر شخص کے نزدیک اس کا مفہوم جداگانہ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ کہ وہی قوم جو اس اصطلاح کے متعیّن مفہوم سے اُمّتِ واحدہ تھی، فرقوں میں بٹ گئی اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گئی۔ تاریخ میں مسلمانوں کے سینکڑوں فرقوں کا تذکرہ آپ کے سامنے آئے گا لیکن ان میں کوئی ایک فرقہ بھی ایسا نہیں ملے گا جس نے یہ کہا ہو وہ اسلام کو چھوڑ کر کسی اور

دین کی دعوت دے رہا ہے۔ ہر ایک، اسلام کی طرف دعوت دینے کا مدعی تھا اور ہر فرقہ دوسرے کے دعویٰ کی تکذیب کرتا تھا۔ ماضی کو چھوڑیئے اور حال کی طرف آیئے۔ آج بھی مسلمانوں میں متعدد فرقے ہیں اور ان سب کا دعویٰ یہی ہے کہ وہ اسلام پر قائم ہیں اور اسی کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ اس کے باوجود ہر فرقہ اپنے آپ کو اسلام کا علمبردار قرار دیتا ہے اور دوسروں کے اسلام کو کفر بتاتا۔ اور ان میں سے کوئی شخص اس کا فیصلہ نہیں کر سکتا کہ کس کا دعوائے اسلام سچا ہے اور کس کا جھوٹا۔ اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ اس اصطلاح کا کوئی متعین مفہوم سامنے نہیں۔ ان اصطلاحات کے مفہوم کے عدم تعین کا مظاہرہ ہم منیر کمیٹی کی روئیداد میں دیکھ سکتے ہیں۔ انہوں نے پاکستان کے علمائے کرام سے کہا کہ وہ بتائیں کہ مسلمان کسے کہتے ہیں۔ یعنی اس اصطلاح کا مفہوم کیا ہے۔ ان میں سے اکثر و بیشتر تو اس سوال کا سرے سے کوئی جواب ہی نہ دے سکے ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔ اور جنہوں نے جواب دیا ان میں سے کسی کا جواب دوسرے کے جواب سے ملتا نہیں تھا۔ ان بنیادی اصطلاحات کے مفہوم کے عدم تعین کا نتیجہ ہے کہ قوم اس قدر تشتت و انتشار، اور فساد و خلفشار کا شکار ہو رہی ہے۔ ہر ایک کی زبان پر لفظ اسلام کا ہے لیکن ہر ایک کا راستہ جدا جدا اور منزل الگ الگ ہے۔ قرآن کریم نے تفرقہ کو جو شرک قرار دیا ہے (۳۰/۳۲) تو اس کے یہ معنی نہیں کہ مسلمانوں کے مختلف گروہ خدا کے ساتھ بتوں کو پوجنے لگ گئے ہیں۔ توحید کے معنی ہیں ساری قوم کے سامنے ایک نصب العین حیات ہو (جو خدا کا متعین کردہ ہو) اور شرک سے مراد ہے ہر گروہ کا الگ الگ نصب العین ۔۔۔۔ یعنی اسلام کا اپنا اپنا مفہوم!

تشتت و انتشار کے عذاب میں گرفتار قوم کی ایک خرابی یہ بھی ہوتی ہے کہ اگر وہ کبھی ان خرابیوں کے ازالہ کی فکر کرے، تو بجائے اس کے ان خرابیوں کے علل و اسباب پر غور کر کے انہیں دور کرنے کی کوشش کرے، وہ ان میں ۔۔۔ ایک اور خرابی کا اضافہ کر لیتی ہے ۔۔۔ جس طرح (مثلاً) فرقہ بندی کی خرابیوں کو دور کرنے کا خیال لے کر اٹھنے والا، ایک نیا فرقہ بنا کر بیٹھ جاتا ہے، اور پارٹیوں کے پھیلائے ہوئے فسادات کو مٹانے کا دعویدار، ان میں ایک اور پارٹی کا اضافہ کر دیتا ہے۔ چنانچہ لفظ اسلام کے مفہوم کے عدم تعین سے گھبرا کر، قوم نے (بجائے اس کے کہ وہ اس اصطلاح کا مفہوم متعین کرنے کی کوشش کرے) اب ان اصطلاحات میں ایک اور اصطلاح کا اضافہ کر لیا ہے اور وہ اصطلاح ہے ۔۔۔ نظریۂ پاکستان ۔۔۔ اس جدید اصطلاح کو وضع (یا اختیار) کئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ اس کے بھی اتنے ہی مفہوم ہو گئے ہیں جتنے مفاہیم لفظ اسلام کے تھے۔ اب ہر پارٹی نظریۂ پاکستان کے تحفظ کی مدعی ہے اور ہر پارٹی دوسری پارٹی سے، اس بنا پر برسرِ پیکار کہ نظریۂ پاکستان کے حامل ہم ہیں، فریق مخالف نہیں۔ آیئے ہم دیکھیں کہ اس اصطلاح کا مفہوم کیا ہے۔

(۲)

پولیٹیکل سائنس (علم السیاسیات) کی رو سے، مملکت (STATE) سے مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ ایک خطۂ زمین میں بسنے والے افراد، ایک ہیئتِ اجتماعیہ (انفرادی کے بجائے اجتماعی زندگی بسر کرنے) کا تہیہ کر کے ایسا نظم و نسق قائم کریں جس سے وہ ملک مستحکم ہو اور اس کے باشندے خوشحال اور ہر قسم کے خطرات سے مامون ۔۔۔ اس مملکت کو اس سے غرض نہیں ہوتی کہ افرادِ مملکت کا تصورِ زندگی کیا ہے اور نظریات و معتقدات

کئی قسم کے ہیں۔ یہ اُن افراد کا ذاتی معاملہ ہوتا ہے۔ اس قسم کی مملکت کو قومی یا وطنی مملکت کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس، مملکت کا ایک تصور قرآن نے دیا تھا اور وہ یہ کہ ایک قسم کا نظریۂ حیات اور فلسفۂ زندگی رکھنے والے افراد، اپنی منفرد ہیئتِ اجتماعیہ متشکل کرنے کا فیصلہ اور عزم کریں۔ ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں ہندوؤں کے پیشِ نظر ایک قومی یا وطنی مملکت کا قیام تھا۔ اس کے برعکس تحریکِ پاکستان کے پیشِ نظر اس قسم کی مملکت کا قیام تھا جس کا تصور قرآن نے دیا تھا۔ اس کا صحیح نام تو قرآنی مملکت تھا لیکن غیر مسلموں کو سمجھانے کے لئے (نیز اسے تھیاکریٹک سٹیٹ سے متمیز کرنے کے لئے) پہلے علامہ اقبالؒ نے اور اس کے بعد قائدِ اعظمؒ نے اسے نظریاتی مملکت (IDEOLOGICAL STATE) کہہ کر پکارا۔ — یعنی وہ مملکت جس کی بنیاد ایک خاص نظریۂ حیات (IDEOLOGY) پر ہوگی۔ اسی سے نظریۂ پاکستان (IDEOLOGY OF PAKISTAN) کی اصطلاح وجود میں آئی۔ یعنی ایسی مملکت جو ہمارے، آپ کے، یا ہندوستان میں بسنے والے افراد کی اکثریت کے، یا وہاں کی پوری کی پوری آبادی کے ذاتی خیالات یا مقاصد کے مطابق متشکل نہیں ہوگی بلکہ قرآنی اقدار کے فروغ اور برومندی کے لئے وجود میں لائی جائے گی۔

آگے بڑھنے سے پہلے، ایک نکتہ کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ کہ ہم ان مقامات میں "اسلام" کی جگہ "قرآن" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، لفظ "اسلام" کا مروجہ مفہوم، متعین نہیں رہا۔ اس لئے جب اس لفظ کا استعمال کیا جاتا ہے تو کسی کے سامنے نہ کوئی متعین مفہوم آتا ہے، اور نہ ایسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معانی متعین کرنے کے لئے کس طرف رجوع کیا جائے۔ اس کے برعکس جب لفظ "قرآن" استعمال کیا جائے تو اس سے ہر ایک کی نگاہ ایک خاص کتاب کی طرف اٹھتی ہے جس کے متعلق ہر مسلمان کا ایمان ہے کہ وہ خدا کی عطا کردہ ہے اور ہمارے لئے ابدی راہ نمائی کا ذریعہ۔ لہٰذا، اس ذہنی خلفشار اور نظری انتشار کے عالم میں "قرآن" کے لفظ سے، کم از کم توجہات ایک مرکز پر تو مرکوز ہو جاتی ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ ہم اسلام کے بجائے قرآن کا لفظ استعمال کیا کرتے ہیں۔ ورنہ اگر صدرِ اوّل کی طرح اسلام کا متعین مفہوم ہمارے سامنے ہوتا تو اسلام اور قرآن کے الفاظ کا عملاً مفہوم ایک ہی ہوتا — اسلام اس نہجِ زندگی کا نام ہے جو قرآن کے مطابق بسر کی جائے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

گر تو می خواہی مسلماں زیستن   نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

چونکہ گروہ بندانہ مفاد کا تقاضا یہ ہوتا ہے (خواہ وہ مذہبی فرقوں کی شکل میں ہو اور خواہ سیاسی پارٹیوں کی صورت میں) کہ قوم کے سامنے، اس کے نظریۂ حیات اور نصب العینِ زندگی کے متعلق کوئی متفق علیہ اور متعین مفہوم نہ آنے پائے، اس لئے قرآن کا نام سامنے لانے سے ان کی طرف سے یہ اعتراض وارد کر دیا جاتا ہے کہ قرآن بےشک ایک متعین کتاب کا نام ہے لیکن اس کتاب کا مفہوم تو متعین نہیں۔ اس کی تعبیر الگ الگ کی جاتی ہے لہٰذا، اس سے بھی انتشار اور خلفشار کی وہی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو لفظ "اسلام" سے پیدا ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ (انسانی تصانیف میں بھی) ایک عمدہ کتاب کی بنیادی خوبی یہ قرار دی جاتی ہے کہ وہ اپنے مفہوم کو واضح اور متعین طور پر سامنے لائے۔ اگر کوئی تحریر ایسے الفاظ میں منضبط ہو کہ وہ ہر شخص کو، اس کی منشاء کے مطابق (الگ الگ) معانی دے دے، تو وہ کتاب اٹھا کر پھینک دینے کے قابل سمجھی جاتی ہے۔ جب انسانی تصانیف کے عمدہ ہونے کا معیار یہ ہے تو ایک ایسی کتاب جس کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ وہ

کسی انسان کی نہیں، بلکہ انسانوں سے بلند و بالا، خود خدا کی تصنیف ہے، کیا اس کی کیفیت یہ ہوگی کہ اس کے الفاظ، مختلف اور متضاد معانی دینے کے قابل (CAPABLE) ہوں؟ بالخصوص جبکہ اس کا دعوےٰ یہ ہو کہ اس اس کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں ــــ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۔ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اِخْتِلَافًا کَثِیْرًا ..... (۴/۸۲) "کیا یہ لوگ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے۔ اگر یہ اس میں غور و فکر سے کام لیں تو ان پر یہ حقیقت واشگاف ہو جائے کہ اگر یہ کتاب خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتی تو اس میں وہ بہت سے اختلافات پاتے ــــ سوچئے کہ جس کتاب کا بنیادی دعویٰ یہ ہو کہ اس کی کیفیت یہ ہوگی کہ وہ ہر ایک کو الگ الگ تعلیم دے؟

دوسری بات یہ سمجھ لینی چاہیئے کہ قرآن کریم کی تعلیم کا ایک حصہ وہ ہے جس میں اس نے انسانی زندگی کے لئے راہ نمائی دی ہے (اور یہی حصہ اس کے بنیادی مقصد سے متعلق ہے) انہیں اصول حیات یا مستقل اقدار کہا جائے گا ــــ یہ اصول و اقدار بالکل واضح اور متعین ہیں اور ان کے سمجھنے میں کوئی اختلاف نہیں پیدا ہو سکتا۔ امور مملکت کا تعلق اسی گوشہ سے ہے۔ قرآنی تعلیم کا دوسرا گوشہ وہ ہے جس کا تعلق حقائق کائنات اور مابعد الطبیعاتی مسائل (META PHYSICS) سے ہے۔ ان حقائق کے سمجھنے کا مدار، انفرادی فکر اور بہ ہیئت مجموعی انسانی علم کی سطح پر ہے۔ جوں جوں انسانی علم کی سطح بلند ہوتی جائے گی، یہ حقائق بے نقاب ہوتے جائیں گے اور کوئی شخص جس قدر زیادہ غور و فکر سے کام لے گا، وہ انہیں اسی قدر زیادہ عمدگی سے سمجھ سکے گا۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے کہ:

وَمِنْ اٰیٰتِہٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِیْھِمَا مِنْ دَآبَّۃٍ ط وَھُوَ عَلٰی جَمْعِھِمْ اِذَا یَشَآءُ قَدِیْرٌ ۔ (۴۲/۲۹)

اور خدا کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے ارض و سمٰوٰت (زمین اور دیگر اجرام فلکی) کو پیدا کیا۔ اور ان میں ذی حیات کو پھیلا دیا۔ اور وہ اس پر بھی قادر ہے کہ اپنے قانون مشیت کے مطابق، زمین اور ان اجرام کے ذی حیات کو اکٹھا کر دے۔

ظاہر ہے کہ اس آیت کا مفہوم آج سے کچھ عرصہ پہلے کچھ اور لیا جاتا تھا اور آج (بالخصوص تسخیر قمر کے بعد) اس کا مفہوم واضح ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اور جس دن کسی اور کرہ کے ذی حیات زمین پر لائے جائیں گے یا ہم وہاں جا سکیں گے تو اس آیت کا مفہوم متعین ہو جائے گا۔ اسی قسم کے حقائق ہیں جن کا صحیح مفہوم سامنے آنے کے سلسلہ میں فرمایا کہ:

سَنُرِیْھِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَھُمْ اَنَّہُ الْحَقُّ ..... (۴۱/۵۳)

ہم انہیں، خارجی کائنات اور خود ان کی دنیا میں اپنی نشانیاں دکھاتے چلے جائیں گے۔ تا آنکہ یہ بات واضح طور پر ان کے سامنے آ جائے کہ قرآن جو کچھ کہتا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے۔

یوں ان حقائق کا مفہوم متعین ہوتا جائے گا۔ اور ظاہر ہے کہ "ان نشانیوں کے بے نقاب" ہونے کے بعد بھی ان کا

مفہوم، ہر شخص کی علمی اور فکری استعداد کے مطابق اس کی سمجھ میں آئے گا۔
لیکن یہ شرائط، لبیط حقائق کے مفہوم سے متعلق ہیں۔ جہاں تک انسانی زندگی کی راہ نمائی اور امور مملکت کا تعلق ہے، قرآنی اصول و اقدار کا مفہوم متعین اور واضح ہے۔ (مثلاً) جب وہ اسلامی مملکت کے متعلق کہتا ہے کہ ۔۔۔ وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) ۔۔۔ ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہوں گے ۔۔۔ تو فرمائیے کہ اس اصول کا مفہوم سمجھنے میں کسی قسم کا الجھاؤ یا اختلاف پیدا ہو سکتا ہے؟ (یاد رکھئے۔ قرآن اصول دیتا ہے۔ ان اصولوں کو بروئے کار لانے کا پروگرام، ہر دور کی قرآنی مملکت خود متعین کرتی ہے)۔
لہٰذا، اگر نظریۂ پاکستان (یا اسلامی مملکت کے اصول و مبانی) کا تعین قرآن کریم کی رو سے کیا جائے تو اس کے مفہوم میں کوئی الجھاؤ یا ابہام رہ سکتا ہے، نہ اختلاف یا تضاد پیدا ہو سکتا۔

(۰)

قرآن کریم کی رو سے، اسلامی مملکت کی بنیاد اس حقیقتِ کبریٰ پر ہے کہ اس میں کوئی شخص نہ کسی دوسرے شخص کا محکوم ہوتا ہے نہ محتاج۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

کس دریں جا سائل و محروم نیست	عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

اس میں حکومت صرف خدا کی ہوتی ہے۔ لیکن یہ اصول، وضاحت طلب ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا خود حکومت کرنے کے لئے تو سامنے نہیں آتا، اس لئے سوال یہ پیدا ہوگا کہ خدا کی حکومت کس طرح قائم ہوگی؟ ایک حکومت تو شخصی ہوتی ہے یعنی مملکت کا پورا اقتدار ایک شخص کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ وہ جو حکم دے، اس کی اطاعت ضروری ہوتی ہے۔ اس کی مملکت میں نہ کوئی شخص یہ جان سکتا ہے کہ اس (صاحبِ حکومت) نے کل کو کیا حکم دینا ہے نہ کسی کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے وہ حکم کیوں دیا ہے۔ اس اندازِ حکومت کو ملوکیت کہا جاتا ہے۔ قرآن، اس قسم کی حکومت قائم نہیں کرنا چاہتا تھا، اس لئے "خدا کی حکومت" بھی ملوکیت کے انداز کی نہیں ہوتی۔ دوسرا اسلوبِ حکومت یہ ہے کہ اطاعت قوانین کی ہو اور قوانین کی غرض و غایت اور علت و حکمت کا ہر ایک کو علم ہو۔ قرآن اسی نہج کی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس مقصد کے لئے، خدا نے ایک ضابطہ قوانین ..... دے دیا ہے جس میں یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ ان قوانین کی حکمت اور غایت کیا ہے۔ اس ضابطۂ قوانین (قرآن) کی اطاعت کا نام خدا کی محکومیت ہے اور یہی مومن اور کافر کا امتیازی نشان ہے۔ قرآن میں ہے:-

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

جو کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے تو یہی لوگ کافر ہیں۔

اور اس کے بعد، خود رسول اللہ سے ارشاد ہوا کہ

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ...... (۵/۴۸)

(اے رسول!) تو ان لوگوں میں کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم کر (ان کے معاملات کے فیصلے اس کے مطابق کرو) اور جب یہ کتاب (الحق) تمہارے پاس آچکی ہے تو پھر انسانوں کے خیالات اور آراء کا اتباع مت کرو۔

یہ ہے خدا کی حکومت قائم کرنے (یا اس کی محکومیت اختیار کرنے) کا عملی طریقہ۔ یعنی قرآنی اصول و اقدار کو حکومت کا آئین قرار دینا اور اس کے قوانین وضوابط کو ملک میں نافذ کرنا۔ یہ وہ بنیادی حقیقت تھی جس کا اظہار علامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ بار بار کرتے رہے۔ یعنی یہ کہ حکومت کا حق خدا کے سوا کسی کو نہیں اور اس کی عملی شکل یہ ہے کہ مملکت میں، ہماری آزادی اور پابندی کے حدود، خدا کی کتاب کے اصول و احکام کی رُو سے متعین ہوں۔ بالفاظِ دیگر، نظریۂ پاکستان سے مراد ہے قرآن کی حکمرانی۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، قرآنِ کریم نے دین کی اساس و بنیاد اس حقیقت کو قرار دیا ہے کہ حق حکومت خدا کے سوا کسی کو نہیں۔ اس حقیقت کے اظہار کے لئے اس نے ایک جامع فقرہ استعمال کیا ہے اور وہ ہے ـــــ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ـــــ دنیا میں کوئی ہستی (شخص، گروہ یا ادارہ) ایسی نہیں جس کی محکومیت اختیار کی جائے بجز اللہ کے۔ محکومیت صرف خدا کی اختیار کی جا سکتی ہے۔

حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

لیکن ہماری بدقسمتی کہ جب دین، مذہب سے بدلا تو، قرآن کے دیگر مہمات اصول کی طرح، اس بنیادی کلمہ کے معانی اور مفہوم بھی یکسر بدل گئے۔ اب ان الفاظ کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے کہ ـــــ "دنیا میں کوئی شے یا ہستی پرستش کے قابل نہیں سوائے اللہ کے" ـــــ دین میں اِلٰہ سے مراد، صاحبِ اقتدار و اختیار تھا ـــــ مذہب میں اس کا مفہوم "پرستش کی شے" ہو گیا۔ اسلام کا اساسی اصول، لا اِلٰہ اِلّا اللہ کے مختصر لیکن بے حد جامع الفاظ میں مرتکز ہے اور اسی کو کلمہ یا کلمہ طیبہ سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کے معنی اصولِ محکم کے ہیں ـــــ جب دین میں اسے کلمہ کہا گیا تھا تو اس سے جو عملی نقشہ سامنے آتا تھا، اس کے متعلق قرآنی تصریحات اوپر پیش کی جا چکی ہیں۔ لیکن اس کے بعد یہی کلمہ، ایک رسم بن کر رہ گیا، یا زیادہ سے زیادہ علم الکلام کا ایک مسئلہ۔ (یا اہلِ تصوّف کا سرِ باطن، جنہوں نے، وحدت الوجود کے فلسفہ کی رُو سے اس کے معنی یہ کر دیئے کہ دنیا میں کوئی معبود ایسا نہیں جو خود خدا نہ ہو۔ یعنی انسانوں نے جتنے معبود تراش رکھے ہیں وہ سب خدا ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔ معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) بہر حال، ہم کہہ یہ رہے تھے کہ قرآن نے اسلامی مملکت کے اساسی اصول کو لا اِلٰہ اِلّا اللہ کے کلمہ سے تعبیر کیا ہے اور اس کا عملی مفہوم یہ ہے کہ مملکت میں اقتدارِ اعلیٰ، قرآنِ مجید کے احکام و اصول و اقدار کو حاصل ہو گا، کسی اور کو نہیں۔ لا اِلٰہ میں دنیا کے ہر صاحبِ اقتدار شخص یا ادارہ کی نفی کی گئی ہے۔

لیکن ہمارے ہاں، جو حضرات اسلامی حکومت کے قیام اور نظریۂ پاکستان کے تحفظ کے مدعی ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی اس اساس کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اس لئے کہ اس اساس پر اُمّتِ واحدہ کی عمارت استوار ہوتی ہے جس میں نہ مذہبی فرقوں کی گنجائش ہوتی ہے نہ سیاسی پارٹیوں کے لئے کوئی جگہ ـــــ نہ جغرافیائی حدود کی بنا پر علاقائی تفریق روا رکھی جا سکتی ہے اور نہ نسلی امتیاز کی بنا پر کوئی تمیز۔ اس میں، ساری کی ساری اُمّت، غیر مسلموں کے مقابلہ میں ایک پارٹی (حزب اللہ) ہوتی ہے جس کے اندر فرقہ سازی، یا پارٹی بازی، یا اسی قسم کی کوئی اور تفریق، شرک سمجھی جاتی اور حکمتِ فرعونی قرار پاتی ہے۔ (۲۸/۴) یہ وجہ ہے کہ

یہ حضرات (لفظ اسلام کی طرح) "نظریۂ پاکستان" کے الفاظ کو تو اس شد و مد سے دہراتے رہتے ہیں لیکن اس کا متعین مفہوم کبھی پیش نہیں کرتے۔ فرقہ بندیوں اور پارٹی بازیوں میں الجھی اور کھوئی ہوئی قوم، توحید خالص کی طرف آنا ہی نہیں چاہتی۔ قرآن کے الفاظ میں ــــ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ (۳۹/۴۵) ان کی کیفیت یہ ہے کہ جب ان لوگوں کے سامنے، جو آخرت کے منکر ہیں، خدائے واحد کا تصور پیش کیا جاتا ہے تو وہ سخت کبیدہ خاطر ہو جاتے ہیں۔ اور جب خدا کے علاوہ، اوروں کا ذکر کیا جائے تو وہ ہشاش بشاش ہو جاتے ہیں۔ دوسری جگہ ہے کہ اہلِ جہنم سے کہا جائے گا کہ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ ۚ وَاِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا ..... جب تمہیں خدائے واحد کی طرف دعوت دی جاتی تھی تو تم اس سے انکار کرتے تھے۔ اور جب اس کے ساتھ اوروں کو بھی شریک کیا جاتا تھا تو تم اس اسلوبِ حکومت کو صحیح تسلیم کر لیتے تھے، حالانکہ حقیقت یہ تھی (اور ہے) کہ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ۔ (۴۰/۱۲) حکومت صرف خدا کی ہو سکتی ہے۔ وہی علو اور کبریائی کا مالک ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے: اِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا۔ (۱۷/۴۶) جب تو قرآن میں خدائے واحد کا ذکر کرتا ہے تو یہ لوگ، نفرت آگیں انداز سے منہ موڑ کر چل دیتے ہیں۔ چنانچہ آج بھی کیفیت یہ ہے کہ خدائے واحد (یعنی قرآنِ خالص) کی حکمرانی کو نہ ہمارا مذہب پرست حلقہ گوارا کرتا ہے نہ سیکولرازم کا حامی گروہ ــــ نہ دیر میں، نہ حرم میں خودی کی بیداری ــــ کیونکہ اس سے ان کے مفادات پر زد پڑتی ہے اور ان کے فرقے اور پارٹیاں باقی نہیں رہتیں۔ حتیٰ کہ ان کا حقِ حکومت بھی باقی نہیں رہتا۔ لیکن ان میں اتنی جرأت بھی نہیں کہ یہ اپنے اس کفر و شرک کا اعلان یا اعتراف کریں۔ اس کے لئے انہوں نے ٹیکنیک یہ اختیار کر رکھی ہے کہ اسلام یا نظریۂ پاکستان جیسی اصطلاحات کا مفہوم متعین نہ کیا جائے۔ انہیں مبہم رکھا جائے۔

ہمارے ہاں یہ شعر جو زبان زدِ خلائق ہے کہ:

پاکستان کا مطلب کیا　　　لا الٰہ الا اللہ!

معلوم نہیں کہنے والے کے سامنے اس کا وہ مفہوم تھا یا نہیں جو قرآنِ کریم کی رو سے، اوپر بیان کیا گیا ہے لیکن بات اس نے پتے کی کہی تھی۔ حقیقت یہی ہے کہ پاکستان (یا اسلامی مملکت) کی اساس 'لا الٰہ الا اللہ' ہے۔ اور اس سے مراد ہے ــــ خدا کی کتاب (قرآنِ مجید) کی حکمرانی ــــ یہی نظریۂ پاکستان سے مراد ہے۔

ـــــــــ (۰) ـــــــــ

خان عبدالولی خان کے مغرب کا چھیڑا ہوا یہ سوال آجکل اخبارات میں بحث کا موضوع بن رہا ہے کہ پاکستان کا تصور کس نے دیا تھا۔ بحث زیادہ تر جذبات پر مبنی نظر آتی ہے۔ پرویز صاحب کا ارادہ ہے کہ آئندہ یومِ پاکستان (۲۳ مارچ) کی تقریب پر (جو ۲۶ مارچ کی صبح ۹ بجے ادارہ کے سبزہ زار میں منعقد ہوگی) اس سوال کو اپنے درس کا موضوع قرار دیں اور حقائق و دلائل کی روشنی میں اس کا جواب پیش کریں۔ اس درس کی اہمیت واضح ہے۔ امید ہے کہ ہم اسے (مشروط بہ صبر) اپریل ۱۹۸۲ء کی اشاعت میں شائع کر سکیں گے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فرقے کیسے مٹ سکتے ہیں؟

قرآن نے دین کو مکمل کر دیا اور اس کے بعد مسلمانوں سے کہہ دیا کہ تمہارا شعارِ زندگی اب یہ ہے کہ

وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰہِ جَمِیۡعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوۡا (۳/۱۰۳)

تم سب کے سب مل کر اس ضابطۂ خداوندی کو محکم طور پر تھامے رہو اور فرقوں میں مت بٹ جاؤ۔

یہ ہے دین کا اصل الاصول۔ اِسی میں تمہاری فلاح و بہبود کا راز مضمر ہے اور اسی سے خود دین کا (یعنی اس نظامِ زندگی کا جو تمہارے لئے تجویز کیا گیا ہے) قیام، تمکن اور استحکام وابستہ ہے۔ اس آیۂ جلیلہ کے مختلف الفاظ پر غور کیجئے حقیقت اُبھر کر سامنے آجائے گی۔ سب سے پہلے یہ کہ، حَبۡلِ اللّٰہ ایک ہے۔ ایک سے زیادہ نہیں۔ دین کا ضابطہ قرآن ہے اور یہی وہ عُرۡوَۃِ الۡوُثۡقٰی (۲/۲۵۶) وہ محکم سہارا ہے جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ (لَا انۡفِصَامَ لَـهَا) کبھی دغا نہیں دے سکتا۔ جو ہر زمانے میں۔ ہر مقام پر۔ تمام نوعِ انسانی کے لئے واحد اور مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ ذہنِ انسانی کے وضع کردہ نظامِ زندگی زمانے کے تقاضوں کے بدلنے سے ٹوٹتے اور بنتے، بنتے اور ٹوٹتے رہتے ہیں —— زماں زماں شکند آنچہ می تراشد عقل —— لیکن یہ ضابطۂ خداوندی زمان اور مکان کی نسبتوں سے بلند اور حدود و قیود کے امتیازات سے ماوراء ہے۔ اس کے اصول، زندگی کی وہ ابدی اور مستقل اقدار ہیں جن میں کبھی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ لَا تَبۡدِیۡلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ ؕ (۱۰/۶۴)

دین اجتماعی ہے

(۲) وَاعۡتَصِمُوۡا میں جمع کے صیغے (تم سب) اور جَمِیۡعًا کی تخصیص سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ دین، خدا اور بندے کے درمیان انفرادی تعلق کا نام نہیں کہ ہر شخص اپنی اپنی جگہ بیٹھے۔ اپنے اپنے انداز سے "گیان دھیان" کے ذریعے خدا سے لَو لگالے اور اس طرح اپنی "مکتی" (نجات) کا سامان پیدا کرے۔ دین، اجتماعی نظامِ زندگی کا نام ہے۔ جس میں تمام افراد ایک ناقابلِ تقسیم وحدت کی حیثیت سے رہتے اور ایک طریق پر چلتے ہیں۔ ان کی وجۂ جامعیت بھی دین کا اشتراک ہے۔ اسی سے یہ سب ایک اُمت بنتے ہیں۔ وَکَذٰلِکَ جَعَلۡنٰکُمۡ

اُمَّةً وَّسَطًا ۵ (۲/۱۴۳)

(۳) جَمِیْعًا نے اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ اس دین کے مطابق زندگی اسی صورت میں بسر ہو سکتی ہے جب پوری کی پوری اُمّت ایک ہی طریق پر چل رہی ہو۔ اگر اس میں مختلف فرقے پیدا ہو گئے اور ہر فرقہ نے ایک جداگانہ طریق کی پیروی اختیار کر لی، تو یہ دین باقی نہیں رہ سکتا۔ لَا تَفَرَّقُوْا کے حکم نے اس حقیقت کو اور بھی نمایاں کر دیا۔ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا میں امر (حکم) تھا۔ یعنی یہ کرو اور لَا تَفَرَّقُوْا میں نہی ہے (کہ یوں نہ کرو) اور یہ ظاہر ہے کہ جس بات کو امر اور نہی۔ مثبت اور منفی کی حدوں میں گھیر کر بیان کیا جائے اس میں نہ کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی رہتی ہے نہ مزید تاکید و تائید کی ضرورت۔ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ..... ایک جامع اصولِ زندگی ہے جس میں کسی اختلاف یا استثناء کی قطعاً گنجائش نہیں۔

یہ کوئی نیا اُصول نہیں

(۴) قرآن نے یہ بھی بتایا ہے کہ یہ کوئی نیا اصولِ زندگی نہیں جو تمہیں پہلی بار دیا جا رہا ہے۔ یہی اصول ہے جو پہلے دن سے آج تک ہر نبی کی وساطت سے دیا جاتا رہا ہے۔ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ وَمَا وَصَّیْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰى وَعِیْسٰٓى ..... اللہ نے اسی دین (نظامِ زندگی) کا راستہ تمہارے سامنے کھول دیا ہے جس کا حکم اس نے نوحؑ کو دیا تھا۔ وہی دین اب تمہاری طرف وحی کیا جاتا ہے۔ اسی کا حکم ابراہیمؑ اور موسےٰؑ اور عیسےٰؑ کو دیا گیا ہے۔

یہ حکم کیا تھا؟ یہی کہ اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ ..... ۵ (۴۲/۱۳) تم سب اسی دین کو قائم کرنا اور اس میں کسی قسم کا تفرقہ نہ پیدا کر دینا۔ یہی وہ دین کی وحدت اور تفرقہ سے اجتناب تھا جس سے تمام انبیاء کرامؑ (زمان اور مکان کے اس قدر بُعد اور اختلاف کے باوجود) ایک "اُمّتِ واحدہ" بن گئے تھے۔ وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ۵ (۲۳/۵۲ ز ۲۱/۹۲) اے گروہِ انبیاء! یہ تمہاری جماعت اُمّتِ واحدہ ہے۔ تمہاری وجہِ جامعیت یہ ہے کہ میں تم سب کا نشوونما دینے والا ہوں۔ لہٰذا تم صرف میرے قوانین کی نگہداشت کرنا۔

اُمّتِ واحدہ

یہاں اس حقیقت کو نمایاں کیا گیا کہ اُمّت کی وحدت، ضابطۂ زندگی اور قانونِ حیات کی وحدت پر مبنی ہوتی ہے۔ جب تک دین ایک رہے گا، اُمّت بھی ایک رہے گی۔ یا جب تک اُمّت ایک ہو گی، اس کا دین بھی ایک ہو گا۔ جب اُمّت میں تفرقہ پڑ جائے گا۔ تو دین بھی ایک نہیں رہے گا۔ الگ الگ ہو جائے گا۔ اور چونکہ دین ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے اس لئے الگ الگ "دین" کے معنی یہ ہیں کہ اصل دین کہیں باقی نہیں رہا۔

(۵) کسی اُمّت (قوم۔ جماعت) میں تفرقہ پیدا کر دینا کتنا بڑا جرم ہے اس کا اندازہ اس واقعہ

سے لگائیے جسے خدا نے سورۂ طٰہٰ میں بیان کیا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کچھ دنوں کے لئے باہر تشریف لے جاتے ہیں اور بنی اسرائیل کو حضرت ہارونؑ کی زیرِ نگرانی چھوڑ جاتے ہیں۔ جب آپ واپس آتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ قوم نے گئو سالہ پرستی اختیار کر رکھی ہے۔ اس کا جو اثر حضرت موسیٰؑ کی طبیعت پر ہو سکتا تھا ظاہر ہے۔ وہ غصّے سے لال پیلے ہو جاتے ہیں اور اپنے بھائی سے پوچھتے ہیں کہ مَا مَنَعَكَ إِذْ رَأَيْتَهُمْ ضَلُّوا ...... (۲۰/۹۲) "جب تم نے دیکھا تھا کہ یہ لوگ گمراہ ہو رہے ہیں، تو وہ کونسی بات تھی جس کی وجہ سے تم نے انہیں (اس روش سے) روکا نہیں"؟ اب سنیئے کہ حضرت ہارونؑ اس کا کیا جواب دیتے ہیں۔ یاد رہے کہ حضرت ہارونؑ بھی خدا کے رسول ہیں۔ وہ جواب میں کہتے ہیں کہ إِنِّي خَشِيتُ أَنْ تَقُولَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِي ..... (۲۰/۹۴) "مجھے یہ اندیشہ گذرا کہ تو آکر یہ نہ کہہ دے کہ (اے ہارونؑ) تو نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا اور میرے فیصلہ کا بھی انتظار نہ کیا"۔ آپ نے سوچا برادران! کہ یہ بات کیا ہوئی؟ حضرت ہارونؑ نے کہا کہ اگر یہ لوگ جہالت کی وجہ سے، کچھ وقت کے لئے مورتی کی پوجا کرنے لگ گئے تھے تو میرے نزدیک یہ اتنا بڑا جرم نہیں تھا جتنا بڑا جرم ان میں تفرقہ پیدا کر دینا تھا۔ یہ جواب ایک نبی کی طرف سے دیا جاتا ہے اور دوسرا نبی اس سے مطمئن ہو جاتا ہے جیسا کہ آگے چل کر بتایا جائے گا۔ قرآن نے خود فرقہ بندی (تفرقہ) کو شرک قرار دیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ گئو سالہ پرستی بھی شرک تھی اور تفرقہ انگیزی بھی شرک لیکن تفرقہ انگیزی کا شرک ایسا شدید اور سنگین تھا کہ اس سے بچنے کے لئے عارضی طور پر گئو سالہ پرستی کے شرک کو گوارا کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ قرآن اس پر شاہد ہے کہ گئو سالہ پرستی کے جرم کا ازالہ توبہ سے ہو گیا۔ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۚ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ (۲/۵۴) لیکن جب انہوں نے باہمی تفرقہ پیدا کر لیا اور اس طرح اُمتِ واحدہ کی بجائے مختلف گروہوں اور پارٹیوں میں بٹ گئے — وَقَطَّعْنَاهُمْ فِي الْأَرْضِ أُمَمًا ...... (۷/۱۶۸) تو ان پر تباہی اور بربادی۔ ذلّت و خواری۔ محرومی و محتاجی کا ایسا عذاب مسلط ہو گیا جو ہر جگہ سائے کی طرح ان کے پیچھے لگا رہتا تھا۔ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوا ...... (۳/۱۱۱)

شرک سے بھی بڑھ کر

(۵) جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، ہر رسول کا پیغام یہ تھا کہ "دین کو قائم کرو۔ اور باہمی تفرقہ مت پیدا کرو"۔ ہر رسول اس پیغام کے ذریعے ایک جماعت۔ ایک اُمّت متشکل کر کے جاتا۔ اس کی اُمت کچھ وقت تک تو متحد رہتی لیکن اس کے بعد اس میں گروہ بندیاں اور فرقہ سازیاں شروع ہو جاتیں۔ یہ کیوں ہوتا؟ قرآن اس کی وجہ بتاتا ہے کہ وَمَا تَفَرَّقُوا إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ...... (۴۲/۱۴ نیز ۴۵/۱۷) یعنی خدا کی طرف سے اَلْعِلْم (وحی) آ جانے کے بعد، جس کا مقصد تمام اختلافات کو مٹا دینا ہے، باہمی تفرقہ کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ لیکن اس وحی کے وارث، باہمی ضد اور ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے اور ایک دوسرے پر چڑھ دوڑنے

کے جذبہ کی وجہ سے مختلف فرقے بنا لیتے ہیں۔ یعنی اس گروہ بندی اور فرقہ سازی کی وجہ یہ نہیں

فرقہ سازی کا جذبۂ محرکہ

تھی کہ انہیں دین کی کسی حقیقت کے سمجھنے میں غلطی لگ جاتی تھی۔ کوئی شق مشتبہ اور مبہم رہ جاتی تھی۔ خدا کی طرف سے دیئے ہوئے علم میں اشتباہ و ابہام کا کیا کام؟ یہ فرقہ سازی محض ہوسِ اقتدار کی تسکین کے لئے ہوتی تھی۔ ان میں سے جن لوگوں کے دل میں لیڈر بننے کا شوق چرّاتا وہ اپنا فرقہ الگ بنا لیتے۔ پھر ہر فرقہ، دوسرے فرقہ سے آگے نکل جانا اور اس پر غالب آ جانا چاہتا۔ اس سے باہمی کش مکش اور سر پھٹول شروع ہو جاتی اور یوں اس اُمتِ واحدہ کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے اور اس کے ساتھ ہی دین بھی اس تشتت و افتراق کے پردوں میں گم ہو جاتا۔ اس سے یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے آ گئی کہ فرقہ بندی علم و بصیرت اور دلائل و براہین کی بناء پر وجود میں نہیں آتی۔ اس کی بنیاد جذبات پر ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر فرقہ کے لوگ اپنے فرقہ کے برسرِ حق ہونے کے ثبوت میں دلائل ہمیشہ پیش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اور وہ کونسا جذباتی فیصلہ ہے جس کی تائید میں عقلِ فسوں ساز دلائل مہیا نہیں کر دیتی؟

(۷) نزولِ قرآن کے وقت دنیائے مذاہب کی یہی کیفیت تھی۔ (واضح رہے کہ دین تو ایک ہی ہوتا ہے لیکن جب فرقہ بندی میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں تو انہیں مذاہب کہا جاتا ہے) قرآن

نزولِ قرآن کا مقصد

نے اپنے نزول کا مقصد یہ بتایا ہے کہ وہ ان تمام اختلافات کو مٹا کر، خدا کا دین قائم کرے گا اور فرقوں اور گروہوں میں بٹے ہوئے انسانوں کو ایک اُمتِ واحدہ میں تبدیل کر دے گا۔ وَمَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡكَ الۡكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَیِّنَ لَهُمُ الَّذِی اخۡتَلَفُوۡا فِیۡهِ ۙ ...... (۱۶/۶۴) "(اے رسول) تجھ پر یہ کتاب صرف اس لئے نازل کی گئی ہے کہ جن امور میں یہ لوگ باہمی اختلاف کرتے ہیں، تو ان کی وضاحت کر دے"۔ اس کے بعد، جو لوگ اس دینِ واحد کی صداقت کو تسلیم کر لیں گے، یہ کتاب انہیں زندگی کے صحیح راستے کی طرف راہنمائی کرے گی اور اس طرح ان کے لئے موجبِ رحمت بن جائے گی — وَهُدًى وَّرَحۡمَةً لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ ○ (۱۶/۶۴) یعنی تبیانِ حقیقت تو تمام انسانوں کے لئے یکساں ہوگی لیکن ہدایت اور رحمت صرف انہیں کے لئے ہوگی جو اس صداقت پر ایمان لے آئیں گے۔

اس سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آ گئی کہ قرآن کا مقصدِ اوّلیں اختلافات کو مٹا کر دین کی وحدت کا قیام ہے اور اختلافات کا مٹ جانا خدا کی رحمت ہے۔ اسی نکتہ کی وضاحت دوسرے مقام پر ان الفاظ میں کر دی گئی کہ وَلَوۡ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً ..... (۱۱/۱۱۸) "اگر یہ مقصود ہوتا کہ تمام انسانوں کو مجبور کر کے ایک راستے پر چلا جائے تو خدا کے لئے ایسا کرنا کچھ مشکل نہیں تھا"۔ اس نے جس طرح دیگر حیوانات کو اس انداز سے پیدا کیا ہے کہ ہر نوع کا فرد اپنی نوع اور جماعت کے ساتھ رہتا ہے۔ اس سے کبھی اختلاف نہیں کرتا۔ (مثلاً تمام بھیڑیں ایک نہج سے زندگی

گذارتی ہیں اور تمام شیر ایک ہی راستے پر چلتے ہیں)۔ اسی طرح وہ انسانوں کو بھی جبلی طور پر ایک ہی راستے

علیٰ وجہ البصیرت وحدت

پر چلنے پر مجبور کر دیتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے انسانوں کو فکر و عمل کی آزادی دے رکھی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ چاہیں تو اتحاد و اتفاق کی زندگی بسر کریں اور چاہیں تو تشتت و افتراق پیدا کر لیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انہیں بتا دیا گیا ہے کہ تشتت و افتراق کی زندگی عذاب کی زندگی ہے اور "ایک امت" بن کر رہنے کی زندگی رحمت اور سعادت کی زندگی۔ لیکن یہ وحدت اسی صورت میں حاصل ہو سکتی اور قائم رہ سکتی ہے کہ تم اپنے دل کی رضامندی سے اور علیٰ وجہ البصیرت خدا کی کتاب کو اپنا ضابطۂ حیات بنا لو۔ اگر تم نے ایسا کر لیا تو تم نے زندگی کے مقصد کو پا لیا۔ چنانچہ جو آیت اوپر درج کی گئی ہے اس کا اگلا حصہ یہ ہے: وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ ۙ إِلَّا مَن رَّحِمَ رَبُّكَ ...... ان لوگوں کے سوا جو وحی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے خدا کی رحمت کے سزاوار بن جائیں، باقی ایک دوسرے سے اختلاف کرتے رہیں گے حالانکہ انہیں پیدا اس لئے کیا گیا تھا کہ یہ (اپنی رضا و رغبت سے) امتِ واحدہ بن کر رہیں۔ وَلِذَٰلِكَ خَلَقَهُمْ ..... (۱۱/۱۱۸-۱۹)

اس آیت سے یہ حقیقت سامنے آ گئی کہ

(۱) مقصودِ تخلیق انسانی یہ ہے کہ تمام انسان ایک امت (ایک عالمگیر برادری) بن کر رہیں اور باہمی اختلافات پیدا نہ کریں۔

(۲) یہ اختلافات صرف وحی خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے مٹ سکیں گے۔ یہ زندگی رحمت کی زندگی ہے۔

(۳) جو لوگ وحی کے مطابق زندگی بسر نہیں کریں گے ان کے اختلافات مٹ نہیں سکیں گے یہ عذاب کی زندگی ہوگی۔

تفرقہ مت پیدا کر لینا

(۴) ان حقائق کی وضاحت کے بعد مسلمانوں سے کہہ دیا گیا کہ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ .... "دیکھنا! تم بھی کہیں ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے خدا کی طرف سے واضح حقائق مل جانے کے بعد، فرقے بنا لئے اور آپس میں اختلاف کرنے لگ گئے" وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۙ (۳/۱۰۴) "یہ لوگ جو فرقوں میں بٹ جاتے ہیں اور آپس میں اختلاف کرنے لگ جاتے ہیں، ان پر سخت عذاب مسلط کر دیا جاتا ہے"۔ اس کے بعد کی دو آیات میں قرآن نے بتایا ہے کہ اختلاف اور تفرقہ کی زندگی درحقیقت ایمان کے بعد کفر کی زندگی ہے اور روسیاہی کا موجب۔ اس کے برعکس، وحدت و ائتلاف کی زندگی سے سرخروئی نصیب ہوتی ہے۔ اور خدا کی رحمت ـــ (يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكَفَرْتُم بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنتُمْ تَكْفُرُونَ ○ وَأَمَّا الَّذِينَ

ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللّٰهِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ (۳/۱۰۶-۱۰۵)

ان آیات سے ظاہر ہے کہ فرقہ بندی اور باہمی اختلاف کی زندگی لعنت اور عذاب کی زندگی ہے۔ اور خدا کی رحمت ان پر ہوتی ہے جو ایک اُمّت بن کر رہتے اور اختلافات سے بچتے ہیں۔

ضمناً یہ بھی دیکھئے کہ قرآن نے اختلاف اور افتراق کا نتیجہ عذابِ عظیم بتایا ہے۔ عظیم کا لفظ جس باب سے آیا ہے اس میں دوام اور استمرار کا پہلو مضمر ہوتا ہے یعنی یہ عذاب وقتی اور ہنگامی نہیں ہوگا بلکہ استمراری اور دوامی ہوگا۔ جب تک فرقہ بندی رہے گی یہ عذاب بھی مسلط رہے گا۔

فرقہ بندی شرک ہے

(۹) قرآن نے اس سے بھی آگے بڑھ کر مسلمانوں سے کہہ دیا کہ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ (۳۰/۳۱) دیکھنا! کہیں تم توحید پرست ہو جانے کے بعد پھر مشرک نہ بن جانا!!

یہ چیز بڑی تحیر انگیز اور (بظاہر) ناقابلِ فہم تھی کہ مسلمان، ایک خدا پر ایمان لانے کے بعد پھر مشرک کس طرح بن سکتے ہیں؟ کیا یہ بتوں کو پوجنا شروع کر دیں گے؟ قرآن کہتا ہے کہ نہیں۔ شرک بتوں کی پرستش ہی نہیں۔ جیسا کہ ہم بنی اسرائیل کی گئوسالہ پرستی کے قصّے میں دیکھ آئے ہیں، بت پرستی تو "شرکِ خفی" (کم درجے کا شرک) ہے۔ "شرکِ جلی" اور ہے۔ اس کی وضاحت میں بتا دیا کہ شرک ہو جانے سے مطلب یہ ہے کہ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا ۚ ..... یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈال دیا اور فرقے بن گئے۔ اس فرقہ بندی سے ہوتا یہ ہے کہ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (۳۰/۳۲-۳۱) ہر فرقہ اس خیال میں مگن رہتا کہ میں حق پر ہوں اور باقی فرقے باطل پر ہیں۔ فرقہ پرستی کی یہ ایسی نفسیات ہے جس کا مشاہدہ ہم ہر وقت کر سکتے ہیں۔ اس آیت میں كُلُّ حِزْبٍ کے ٹکڑے کو خاص طور پر ذہن میں رکھئے کیونکہ یہ ایک اہم حقیقت کا پردہ کشا ہے جس کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔

بہرحال قرآن نے اُمّتِ واحدہ سے کھلے کھلے الفاظ میں کہہ دیا کہ اگر تم نے دین میں فرقے پیدا کر لئے تو یہ توحید نہیں، شرک ہوگا۔ اور کوئی فرقہ یہ کہہ کر اس سے بری الذمہ نہیں ہو سکے گا کہ ہم اصل اور حقیقی اسلام پر قائم ہیں اور دوسرے فرقے باطل پر ہیں۔ اسی بناء پر رسول اللہؐ سے کہہ دیا گیا کہ إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ۚ ۝ (۶/۱۶۰) جو لوگ اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر دیں، اور ایک فرقہ بن کر بیٹھ جائیں، اے رسول! تجھے ان سے کوئی تعلق نہیں"۔ یعنی فرقے بنانے والوں سے نہ خدا کا کوئی تعلق ہے (کیونکہ وہ توحید پرست نہیں رہتے مشرک ہو جاتے ہیں) اور نہ ہی خدا کے رسول کا ان سے کوئی واسطہ۔ کیونکہ رسول نے تو ایک دین قائم کیا اور ایک اُمّت بنائی تھی۔ یہ الگ اُمّت بنا لینے والے، درحقیقت ایک متوازی دین (نظامِ زندگی) کے حامل ہو گئے اس لئے انہیں اس رسول سے کیا تعلق؟

فرقہ سازوں سے رسول کا کوئی تعلق نہیں

اس مقام پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ رسول اللہؐ نے ایک اُمّت بنائی جو دینِ حق پر قائم تھی۔ اِس اُمّت میں سے ایک فرقہ نکل کر الگ ہو گیا اب ظاہر ہے کہ یہ نیا فرقہ شرک کے جرم کا مرتکب اور باطل پرست ہے۔ بقیہ اُمّت کو جو اپنے مسلک پر قائم ہے اسے ایک فرقہ ٹھہرا کر اسی جرم کا مرتکب قرار دے دینا تو کسی صورت میں درست نہیں ہو سکتا؛ یہ اعتراض اہم ہے لیکن اس کا جواب یا اس مشکل کا حل، ذرا آگے چل کر سامنے آئے گا۔

صلوٰۃ وجہِ جامعیت

(۹) سورۂ روم کی جس آیت میں کہا گیا ہے کہ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ .... اس سے پہلے ہے: وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ۔ "صلوٰۃ کو قائم رکھو، اور مشرکین میں سے نہ ہو جاؤ" یعنی ان میں سے جنہوں نے دین میں فرقے پیدا کر دیئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ دین میں نظامِ صلوٰۃ وہ بنیادی حقیقت ہے کہ جب تک یہ قائم رہے، فرقے نہیں بن سکتے۔ یہی وجہ ہے جو قرآن نے کہا ہے کہ جب انبیاءؑ کے جانے کے بعد اُن کی اُمّت فرقوں میں بٹ جاتی ہے تو وہ حقیقتِ صلوٰۃ کو ضائع کر دیتی ہے۔ اور اپنے جذبات کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ ...... ؕ (۱۹/۵۹) اس کی زندہ شہادت خود ہماری اپنی حالت ہے۔ ہماری کیفیت یہ ہے کہ وہی صلوٰۃ جسے قرآن نے وحدتِ اُمّت کا محکم ذریعہ بنایا تھا، آج مختلف فرقوں کی تمیز و تفریق کی علامت بن گئی ہے۔ چنانچہ اگر آپ نے دیکھنا ہو کہ فلاں شخص کس فرقے سے متعلق ہے تو یہ دیکھو کہ وہ نماز کس طرح پڑھتا ہے؛ (یہی وجہ ہے کہ جب طلوعِ اسلام کے خلاف اس کے مخالفین نے یہ پروپیگنڈہ شروع کیا کہ ایک نیا فرقہ ہے انہیں اپنے اس دعویٰ کی تائید میں یہ الزام بھی تراشنا پڑا کہ یہ لوگ تین وقت کی نماز پڑھتے ہیں اور ایک رکعت میں ایک ہی سجدہ ضروری سمجھتے ہیں۔ گویا انہوں نے ثابت یہ کرنا چاہا کہ چونکہ ان کی نماز اور فرقوں سے مختلف ہے اس لئے یہ ایک نیا فرقہ ہے۔ حالانکہ یہ سب بہتان تراشی اور افترا پردازی تھی۔ نہ طلوعِ اسلام کوئی الگ نماز تجویز کرتا ہے نہ الگ فرقہ بناتا ہے (جس کے نزدیک فرقہ سازی شرک ہو وہ بھلا خود فرقہ کیسے بن جائے گا؟)

بہرحال، یہ جملہ معترضہ تھا۔ ہم کہہ رہے تھے کہ قرآن نے صلوٰۃ کو اُمّتِ واحدہ کے لئے وجہِ جامعیت قرار دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ خود رسول اللہؐ کے زمانے میں بعض تفرقہ انگیزوں نے ایک نئی مسجد تعمیر کی

مسجدِ ضرار

تو قرآن نے جس شدّت سے اس کی مخالفت کی اس کا اندازہ سورۂ توبہ کی متعلقہ آیات سے لگ سکتا ہے۔ سنیئے! اور غور سے سنیئے کہ قرآن اس باب میں کیا کہتا ہے: وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مَسْجِدًا ضِرَارًا ...... (۹/۱۰۷) "جن لوگوں نے اس غرض سے مسجد تعمیر کرائی کہ اس سے ملّتِ اسلامیہ اور خود دین کو نقصان پہنچایا جائے"۔ وَكُفْرًا "اور کفر کی حمایت کی جائے یا کفر کی روش اختیار کی جائے"۔ وَتَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ ..... "یعنی اس غرض سے کہ مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کیا جائے۔ تم اس مسجد کو مسجد سمجھتے ہو؟ یہ مسجد نہیں۔ - إِرْصَادً

لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ .... "یہ وہ کمین گاہ ہے جس میں بیٹھ کر وہ شخص جو اس سے پہلے خدا اور رسول (نظامِ خداوندی) کا دشمن تھا، ملت پر تیر اندازی کرے گا" یعنی یہ مسجد نہیں، یہ وہ قلعہ ہے جس کے اندر خدا اور رسول کے دشمن پناہ لے کر دین کے قصرِ مشیّد کو منہدم کرنے کی مذموم کوشش کریں گے۔ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰى .... "یہ قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ اس مسجد کی تعمیر سے ہمارا ارادہ بجز بھلائی کے اور کچھ نہیں۔ ہم دین کی تخریب تھوڑا ہی چاہتے ہیں"۔ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ .... "تم ان کی باتوں میں نہ آجانا۔ خدا گواہ ہے کہ یہ یکسر جھوٹے ہیں"۔ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا .... "اے رسول! تم اس مسجد میں ایک قدم بھی نہ رکھنا"۔ یہ مسجد تو یوں سمجھئے کہ دوزخ کے کنارے پر کھڑی ہے۔ جس نے اسے بنایا ہے اور جو اس میں داخل ہوگا۔ یہ ان سب کو لے کر جہنم کے عمیق گڑھے میں جا گرے گی۔ $\left(\frac{9}{107-109}\right)$ چنانچہ تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ رسول اللہ نے صحابہؓ کو بھیج کر اس مسجد کو منہدم کرا دیا۔

اس واقعہ سے آپ اندازہ لگائیے کہ اسلام میں فرقہ بندی کس قدر شدید اور سنگین جرم ہے کہ (اور تو اور) اگر کسی مسجد کی تعمیر سے بھی فرقہ بندی کی جھلک پڑتی ہو، تو اس مسجد کا گرا دینا ضروری ہو جاتا ہے۔ مسجد گرائی جا سکتی ہے لیکن فرقہ کی طرح نہیں پڑنے دی جا سکتی کیونکہ فرقہ بندی بہ نصِ صریح شرک ہے اور شرکِ جلی۔

—(۵)—

اُمّتِ واحدہ کی تشکیل

(۱۰) یہ تھیں وہ کھلی کھلی ہدایات جو وحدتِ اُمّت کے سلسلہ میں مسلمانوں کو دی گئیں۔ انہی ہدایات کی بنا پر نبی اکرمؐ نے اُمّتِ واحدہ کی تشکیل فرمائی۔ یہ وہ اُمّت تھی جس کا نظام ایک تھا۔ ضابطۂ زندگی ایک تھا۔ مرکز ایک تھا۔ دین ایک تھا۔ راستہ ایک تھا۔ نصب العین ایک تھا۔ ان میں نہ کسی قسم کا اختلاف تھا نہ افتراق۔ یہی تھی وہ جماعت جس کے متعلق خدا نے کہا ہے کہ فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ .... $\left(\frac{3}{102}\right)$ "اللہ نے تمہارے دلوں کو ایک دوسرے میں مدغم کر دیا۔ اور دین کے ذریعہ تمہیں ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا"۔ رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ۔

اس کے بعد اُمّت پر کیا گزری؟ یہ ایک حدیث ہے دلخراش اور داستان ہے جگر سوز۔ اس لئے تفصیل میں گئے بغیر، قرآن کے الفاظ میں صرف اتنا سن لیجئے کہ وَمَا تَفَرَّقُوْۤا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ ؕ .... $\left(\frac{42}{14}\right)$ جس طرح اممِ سابقہ نے، وحی کے مل جانے کے بعد، باہمی ضد اور سرکشی کے جذبے سے دین میں فرقے بنا ڈالے تھے، یہ بھی فرقوں میں بٹ گئے۔ قرآن کے اس قدر واضح، بیّن اور صریح احکام و ہدایات، تنبیہات و تاکیدات کی موجودگی میں، اُمّت کا فرقوں میں بٹ جانا یقیناً ایک تحیّر انگیز واقعہ ہے۔ لیکن اس حقیقت سے کیسے انکار ہو سکتا ہے کہ اُمّت

فرقوں میں بٹی اور یہ فرقے اب تک موجود ہیں۔ اس مقام پر رہ رہ کر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ فرقوں میں بٹنے والے اپنی اس روش کے جواز میں بالآخر کوئی تو دلیل پیش کرتے ہی ہوں گے؟ جی ہاں! وہ دلیل پیش کرتے ہیں۔ غور سے سنیئے وہ دلیل کیا ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ.... رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ اِخْتِلَافُ اُمَّتِیْ رَحْمَۃٌ (میری اُمّت میں اختلاف رحمت ہے)۔ آپ نے سوچا کہ یہ بات کیا ہوئی؟ یعنی وہ اختلاف جس کے متعلق قرآن نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ وہ خدا کا عذاب ہے۔ باعثِ کفر ہے۔ شرک ہے۔ اسی اختلاف کے متعلق کہا جاتا ہے کہ (معاذ اللہ) رسول اللہؐ نے اسے باعثِ رحمت قرار دیا! جو شخص ذرا بھی قرآنی تعلیم سے مَس رکھتا ہو، وہ بلا ادنیٰ تامل کہہ دے گا کہ عربی زبان کا یہ فقرہ کبھی رسول اللہؐ کا ارشاد نہیں ہو سکتا۔ حضورؐ نے کبھی ایسا نہیں فرمایا ہوگا۔ یہ ناممکن ہے کہ خدا ایک چیز کو عذاب قرار دے اور اس کا رسول اُسے رحمت بتائے۔ لیکن آپ یہ کچھ کہتے رہیئے اور فرقہ پرست اپنی بات پر اڑے رہیں گے کہ نہیں ــــ رسول اللہؐ نے ایسا فرمایا اور ضرور فرمایا تھا۔ یہ محض اس لئے کہ اگر اس فقرے کو حدیثِ رسول اللہؐ قرار نہ دیا جائے تو پھر فرقہ بندی کے لئے جواز کی راہ کوئی نہیں رہ جاتی۔ لیکن وہ جو قرآن نے کہا ہے کہ جو لوگ حقیقت کو طوعاً (بہ طیبِ خاطر) نہیں مانتے، حقیقت ان سے اپنے آپ کو کرہاً (مجبوراً) منوا لیتی ہے۔ اس کی ایک مثال ہمارے سامنے ہے۔ عرصہ کی بات ہے کہ مرزائیوں کے خلاف یہ اعتراض کیا گیا کہ انہوں نے ایک نیا فرقہ بنا کر اُمّت میں اختلاف پیدا کر دیا ہے۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ اگر ہمارے کسی عمل سے اُمّت میں اختلاف پیدا ہو گیا ہے تو اُمّت کو اس کے لئے ہمارا شکر گذار ہونا چاہیئے نہ کہ شکوہ سنج۔ اس لئے کہ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ اختلافِ اُمّتی رحمۃ۔ ہمارا یہ نیا فرقہ اُمّت کے لئے مزید رحمتوں کا باعث ہے۔

اختلافِ اُمّتی رحمۃ

یہ حدیث نہیں

آپ سوچیئے کہ ان کے اس جواب کا جواب الجواب کیا ہو سکتا ہے؟ اس کے جواب میں (جمعیتِ اہلِ حدیث کے ترجمان "الاعتصام"[1]) کو مجبوراً کہنا پڑا کہ اختلافِ اُمّتی رحمۃ کوئی حدیث ہی نہیں۔ اس لئے اسے سند میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اب اس فقرے کو حدیث نہ قرار دینے سے کیا حاصل؟ اس نے جس قدر تباہی مچانی تھی اس ایک ہزار برس میں مچا دی۔ اس نے اُمّت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ انہیں فرقوں اور گروہوں میں تقسیم کر کے مستقل جنگ و جدل کا سامان پیدا کر دیا۔ اس نے ان کی سلطنتیں تباہ کر دیں۔ ان کی شوکت و عظمت کو تباہ کر دیا۔ ان کی دنیا اور عاقبت دونوں خراب کر دیں۔ ایسی عظیم ہلاکتوں اور تباہیوں کے بعد اگر اس حقیقت کا اعتراف کیا گیا کہ یہ فرمانِ رسول نہیں ہے تو اس سے ان نقصانات کی تلافی کیا ہو گی؟ اس قسم کی ہیں وہ وضعی حدیثیں جن کے متعلق طلوعِ اسلام کہا کرتا ہے کہ یہ عجمی سازش کا نتیجہ ہیں، اور یہی ہے اس کا وہ جرم جس کی پاداش میں

---

[1] الاعتصام۔ مورخہ ۲ اگست ۱۹۵۷ء (مطبوعہ طلوعِ اسلام، بابت ستمبر ۱۹۵۷ء)۔

اسے گردن زدنی اور کشتنی قرار دیا جاتا ہے۔

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس حدیث کو وضعی قرار دیئے جانے کے باوجود، اسے فرقہ بندی کے جواز میں برابر پیش کیا جاتا ہے۔

بہرحال، یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ فرقہ بندی کے جواز میں، اختلافِ اُمتی رحمۃ کو بطور دلیل پیش کیا گیا۔ لیکن اس میں ایک سقم ہے وہ یہ کہ اس کی رُو سے تمام فرقے موجبِ رحمت، فلہٰذا حق پر قرار پا جاتے ہیں۔ اور فرقہ بندی اسے کبھی گوارا نہیں کر سکتی کہ ہر فرقہ کو سچا سمجھا جائے۔ لہٰذا اس کے لئے ایک اور حدیث وضع کی گئی جس میں کہا گیا کہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ میری اُمت میں تہتّر فرقے ہوں گے ان میں سے ایک فرقہ ناجی ہوگا۔ باقی سب جہنمی ہوں گے۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس میں ایک فرقہ کی استثناء نے کس طرح ہر فرقے کو مطمئن کر دیا کہ وہ حق پر ہے اور باقی سب باطل پر ہیں۔

تہتّر فرقے (۷۳)

قرآنِ کریم نے فرقوں کے متعلق کہا تھا کہ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ..... ہر فرقہ اس زعمِ باطل میں مبتلا رہتا ہے کہ وہ حق پر ہے۔ یعنی قرآن نے "کُلُّ حِزْبٍ" (تمام فرقے) کہہ کر اس چور دروازے کو بند کر دیا تھا جس کے راستے فرقہ پرستی کا جھوٹا اطمینان داخل ہو سکتا تھا لیکن اس وضعی روایت نے "ایک فرقہ" کی استثناء سے اس چور دروازے کو چوپٹ کھول دیا۔ چنانچہ ہماری ہزار سالہ تاریخ اس پر شاہد ہے کہ اسی استثناء کی آڑ میں ہر فرقہ اپنے آپ کو ناجی اور دوسرے فرقوں کو جہنمی قرار دینے کے "جہادِ عظیم" میں مصروف چلا آ رہا ہے اور ان کے خون کے چھینٹوں کو اپنے لئے وجہِ سرخروئی سمجھ رہا ہے۔

ایک دوسرے کے خلاف کفر کے فتوؤں کا مشغلہ روزِ اوّل سے جاری چلا آ رہا ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات کی جڑیں آئے دن وجہِ سوہانِ روح ہوتی ہیں۔ ان فسادات کی بیشتر بنیاد مساجد کی "تقسیم" ہوتی ہے۔ باہمی جھگڑے طول کھینچتے ہیں تو پولیس مسجد پر تالہ لگا دیتی ہے، مقدمہ عدالت تک پہنچتا ہے۔ اور اس تمام دنگہ فساد میں ہر فرقہ اپنے آپ کو ناجی اور فریقِ مقابل کو جہنم کا کندہ قرار دیتا ہے، اور ستم ظریفی یہ کہ دونوں اپنے آپ کو اس اسلام کے پیرو قرار دیتے ہیں جس نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا تھا۔

(۰)

پس چہ باید کرد؟

(۱۱) سوال یہ ہے کہ ان حالات میں کیا کیا جائے؟ فرقے بہرحال موجود ہیں اور ان میں کوئی بھی اپنے آپ کو مٹانے کے لئے تیار نہیں، ہر فرقہ، فرقے مٹانے کی تدبیر یہ بتاتا ہے کہ دوسرے فرقے اپنے آپ کو اس فرقے میں شامل کر لیں اور یہ ظاہر ہے کہ اس کے لئے کوئی فرقہ بھی تیار نہیں۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ اس مشکل کا حل کیا ہے؟ یہ سوال بڑا اہم اور بڑا نازک ہے اس لئے اس پر گہرے غور و فکر کی ضرورت ہے۔

(۱) قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ ہر قسم کے اختلافات کو مٹانے آیا ہے۔

(۱۱) اس پر ہمارا ایمان ہے۔

(iii) قرآن ہمارے پاس اپنی اصلی شکل میں موجود ہے۔

اب آپ سوچئے کہ اگر ہم اس کے بعد بھی یہ کہتے ہیں کہ ہمارے اختلافات مٹ نہیں سکتے اور فرقے ختم نہیں ہو سکتے تو اس کی زد کہاں جا کر پڑتی ہے؟ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ (معاذ اللہ) قرآن میں اب اس کی صلاحیت نہیں کہ وہ اختلافات مٹا سکے۔ میں یہ پوچھتا ہوں کہ کیا آپ میں سے کوئی بھی ایسا کہنے کی جرأت کر سکتا ہے؟ لیکن اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ اب ہمارے فرقے مٹ نہیں سکتے تو اس کے معنی اس کے سوا اور کیا ہو سکتے ہیں کہ ہم عملاً اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ قرآن کا یہ دعویٰ صحیح نہیں کہ وہ فرقوں کو مٹا سکتا ہے! اگر قرآن کی صداقت پر ہمارا ایمان ہے تو ہمیں سب سے پہلے اس خیال کو دماغ سے نکال دینا ہوگا کہ قرآن کے ہوتے ہوئے بھی فرقے نہیں مٹ سکتے۔ یاد رکھئے! قرآن کا ہر دعویٰ سچا ہے اور اس میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ اختلافات کو مٹا دے۔ اس کے بعد سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ وہ طریق کیا ہے جس کے مطابق قرآن اختلافات کو مٹاتا ہے۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے ہمارے ہاں (پنجاب میں) ایک جماعت پیدا ہوئی جس کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ خالص قرآن پر عمل کرے گی اور اس طرح مسلمانوں میں پیدا شدہ اختلافات کو مٹا دے گی۔ یہ مقصد بڑا نیک اور یہ دعوےٰ بڑا مبارک تھا۔ لیکن اس کا جو عملی نتیجہ ہمارے سامنے آیا وہ

فرقہ اہلِ قرآن

اس سے بالکل مختلف تھا۔ اس سے سابقہ فرقوں کا مٹنا تو کجا، ان میں ایک اور فرقے "اہلِ قرآن" کا اضافہ ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اختلافات مٹانے کے لئے قرآن نے جو طریق بتایا تھا وہ ان کی نگاہوں سے اوجھل رہا۔ اس لئے ان کی یہ کوشش ناکام رہی۔ بدقسمتی یہ کہ ان کی ناکامی نے خود قرآن کے مشن کو بڑا نقصان پہنچایا۔ اس طرح کہ اب اگر کسی سے کہا جاتا ہے کہ ہمارے اختلافات قرآن کی رُو سے مٹ سکتے ہیں تو اس کے جواب میں طنزاً یا ٹھنڈی سانس بھر کر کہہ دیتا ہے کہ صاحب! یہ نسخہ بھی آزمایا جا چکا اور ناکام ثابت ہو چکا ہے۔ یعنی ان حضرات کی ناکامی نے خود قرآن کے متعلق یہ خیال پیدا کر دیا کہ (معاذ اللہ) اس میں اس کی صلاحیت ہی نہیں رہی کہ یہ اختلافات کو مٹا سکے۔[1]

اختلافات مٹانے کا طریق

(۱۲) اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن ان اختلافات کو مٹانے کا کیا طریق بتاتا ہے؟ سب سے پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ قرآن یہ کہتا ہے کہ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللّٰهِ ..... (۴۲/۱۰) "جس معاملہ میں بھی تمہیں اختلاف ہو اس کا فیصلہ (حکم) اللہ کی طرف سے ہونا چاہیئے"۔ اس میں "حکم" کا لفظ غور طلب ہے۔ یعنی یہ انفرادی چیز نہیں کہ دو آدمیوں میں کسی بھی مسئلہ میں اختلاف ہو اور وہ اپنے طور پر قرآن سے فیصلہ لینے بیٹھ جائیں۔ متنازعہ فیہ امور میں حکم یا فیصلہ، ہمیشہ تیسرے مقام سے ملا کرتا ہے اسے حَکَم یا ثالث کہتے ہیں۔ اسی مقصد کے لئے قرآن نے رسول اللہ سے کہا تھا کہ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا

---

[1] طلوعِ اسلام "اہلِ قرآن کی پھیلائی ہوئی گمراہیاں" کے عنوان سے ایک تفصیلی پمفلٹ شائع کر چکا ہے۔

شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (۴/۶۵) تیرا رب اس حقیقت پر شاہد ہے کہ یہ کبھی صاحبِ ایمان نہیں کہلا سکتے، جب تک یہ اپنے اختلافی امور میں تجھے اپنا حکم (فیصلہ دینے والا) تسلیم نہ کریں اور جو فیصلہ یہاں سے صادر ہوا اس کے خلاف اپنے دل میں گرانی محسوس نہ کریں بلکہ اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں۔"

یعنی قرآن سے فیصلہ انفرادی طور پر نہیں کیا جائے گا بلکہ اس کے لئے ایک زندہ اور محسوس ثالث اور حاکم کی ضرورت ہو گی۔ اس فیصلہ کرنے والی اتھارٹی کو قرآن میں "اللہ اور رسول" کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس آیت سے چند آیات پہلے ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ ..... "اے جماعتِ مومنین! تم اللہ اور ..... رسول کی اطاعت کرو۔ اور تم میں سے جنہیں (اللہ اور رسول کی طرف سے) صاحبِ اختیار بنایا جائے ان کی اطاعت کرو۔ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ..... (۴/۵۹) اگر تم میں کسی

زندہ مرکز

معاملہ میں اختلاف پیدا ہو جائے تو (اسے اپنے طور پر حل کرنے کی کوشش نہ کرو بلکہ) اسے "اللہ اور رسول" کی طرف لوٹا دو۔ اگر تم ایسا نہ کرو گے تو سمجھا جائے گا کہ تمہارا اللہ اور آخرت پر ایمان ہے"۔ اس کے معنی صاف یہ ہیں کہ دو افراد میں اختلاف تو ایک طرف، اگر افرادِ ماتحت کے کسی فیصلہ سے بھی اختلاف ہو تو اسے قرآنی نظام کی مرکزی اتھارٹی (اللہ اور رسول) کی طرف لوٹا دو۔ یہی شرطِ ایمان ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے گا تو یہ کفر ہو جائے گا۔

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قرآن نے تفرقہ اور اختلاف کو کفر سے تعبیر کیا ہے۔ اس کفر سے محفوظ رہنے کی عملی شکل یہ بتائی گئی ہے کہ اُمت کے پاس قرآن ہو اور قرآن کی روشنی میں فیصلہ دینے والا رسول۔ چنانچہ سورۂ آلِ عمران میں ہے: وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَأَنْتُمْ تُتْلَى عَلَيْكُمْ آيَاتُ اللَّهِ وَفِيكُمْ رَسُولُهُ ..... (۳/۱۰۱) تم کس طرح کفر میں مبتلا ہو سکتے ہو؟ جبکہ حالت یہ ہے کہ (۱) تمہارے پاس کتاب اللہ موجود ہے اور (۲) اس کے ساتھ تم میں اس کا رسول موجود ہے"۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب تک اُمت میں (۱) قرآن، اور (۲) رسول موجود ہو فرقے پیدا نہیں ہو سکتے۔

اس سے ہمارے سامنے ایک اور سوال آ گیا۔ اور وہ یہ کہ قرآن کی ان آیات سے تو یہ معلوم ہوا کہ رسول اللہؐ کی موجودگی (یعنی زندگی) تک اُمت نے فرقوں سے بچے رہنا تھا۔ لیکن آپ کے بعد فرقوں سے محفوظ رہنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ کیونکہ فرقوں سے بچنے کے لئے قرآن اور رسول دونوں کی موجودگی کی ضرورت تھی اور جب ان میں سے ایک جزو (رسول) موجود نہ رہا تو فرقہ بندی سے محفوظ رہنے کا امکان بھی باقی نہ رہا۔

قرآن کہتا ہے کہ تم نے بات کو صحیح طور پر نہیں سمجھا۔ تم اس خیال میں ہو کہ "رسولؐ کی موجودگی" سے مراد یہ

فِيكُمْ رَسُولُهٗ کے معنی

ہے کہ جب تک محمدؐ رسول اللہ تم میں زندہ موجود ہیں اُس وقت تک یہ شکل باقی رہے گی جب وہ وفات پا جائیں گے تو پھر "رسول" موجود نہیں رہے گا۔ یہ بات غلط ہے یہ سلسلہ رسول کی طبعی زندگی سے مشروط نہیں۔ اس کے بعد بھی قائم رہے گا۔ چنانچہ سورۂ آلِ عمران میں یہ کہہ کر اس کی صراحت کر دی گئی کہ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَا۟ئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ ...... "محمدؐ بجز اس نیست کہ اللہ کا رسول ہے۔ اس سے پہلے بہت سے رسول (اپنا فریضۂ پیغام رسانی ادا کرنے کے بعد) دنیا سے چلے گئے۔ سو اگر (کل کو) یہ وفات پا جائے یا قتل کر دیا جائے تو کیا تم یہ سمجھ کر کہ یہ نظام اس کی زندگی تک محدود تھا) پھر اپنی سابقہ روش کی طرف لوٹ جاؤ گے؟" وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا ؕ ...... (۳/۱۴۴) "جو (رسول کی وفات پر) اپنی سابقہ روش پر لوٹ جائے گا تو وہ اللہ کو نقصان نہیں پہنچائے گا (اپنا ہی کچھ بگاڑے گا)۔"

اس سے بات بالکل واضح ہو گئی۔ یعنی یہ کہ وَفِيكُمْ رَسُولُ اللّٰهِ ...... سے مراد رسول اللہؐ کی طبعی زندگی نہیں۔ آپؐ کی وفات کے بعد بھی یہ سلسلہ بدستور باقی رہ سکتا تھا۔ جب رسول اللہؐ وفات

رسول اللہؐ کے بعد

پا گئے تو اُمت میں کہرام مچ گیا۔ ایسا ہونا فطری امر تھا۔ شدّتِ جذبات میں بعض لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ جس نظام کو رسول اللہؐ نے قائم فرمایا تھا، اب وہ ختم ہو گیا۔ اس کے لئے وَفِيكُمْ رَسُولُهٗ ...... کی شرط تھی۔ اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لئے حضرت ابوبکر صدیقؓ برسرِ منبر تشریف لائے اور وَفِيكُمْ رَسُولُهٗ ...... کا قرآنی مفہوم اس انداز سے سمجھا دیا کہ اس سے بہتر انداز کوئی ہو نہیں سکتا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ ...... يَآ اَيُّهَا النَّاسُ ! من كان منكم يعبد محمدًا فانه قد مات ـ ومن كان يعبد الله فانه حي لا يموت ـ "اے لوگو! جو تم میں سے محمدؐ کی محکومیت اختیار کئے تھا۔ اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ اس کا معبود وفات پا گیا ہے لیکن جو خدا کی محکومیت اختیار کئے تھا۔ اس کا معبود زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔" اس کے بعد آپ نے وہی آیت پڑھی جو اوپر بیان ہو چکی ہے یعنی: وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ...... اس سے حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آ گئی۔ حاضرین سمجھ گئے کہ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد یہ نظام کس طرح قائم رہے گا۔ چنانچہ وہ اُٹھے اور انہوں نے فوراً خلیفۃ الرسول (یعنی رسول اللہؐ کے جانشین) کا انتخاب کیا اور اس طرح رسول اللہؐ کی وفات سے جو خلا پیدا ہو گیا تھا اُسے پُر کر لیا۔ اس لئے کہ یہ ظاہر ہے کہ کسی کے جانشین کی موجودگی خود اس کی

خلیفۃ الرسول کی حیثیت

اپنی موجودگی ہوتی ہے۔ اس طرح اُمت میں "قرآن اور رسول" بدستور موجود رہے۔

اس مقام پر اتنا اور واضح کر دینا ضروری ہے کہ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد اسلامی نظام قائم کرنے کے فریضہ کی ادائیگی پوری اُمت کے ذمّے عائد ہوتی تھی۔ اس لئے کہ قرآن نے واضح الفاظ میں بتا دیا تھا کہ

(۱) کتاب اللہ کی وارث اُمّت ہے نہ کہ کوئی ایک فرد۔ سورۂ فاطر میں ہے: وَالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ ھُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ۔ اِنَّ اللّٰہَ بِعِبَادِہٖ لَخَبِیْرٌۢ بَصِیْرٌ "اللہ وہ ہے جس نے تیری طرف (اے رسولؐ) یہ کتاب نازل کی جو ان حقیقتوں کو سچ کر دکھانے والی ہے جو اس کے سامنے ہیں"۔ ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْکِتٰبَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ...... (۳۵/۳۱-۳۲) "اس کے بعد اس نے اس کتاب کی وراثت کے لئے اپنے بندوں میں سے (اس اُمّت کو) منتخب کر لیا ہے"۔ یعنی پہلی بات یہ ہے کہ قرآن کی وارث پوری کی پوری اُمّت ہے۔ اس کے بعد آگے بڑھئے۔

(۲) رسول اللہ کا فریضہ یہ تھا کہ یَاْمُرُھُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھٰھُمْ عَنِ الْمُنْکَرِ...... (۷/۱۵۷) وہ معروف کا حکم دیتا تھا اور منکر سے روکتا تھا۔ اب یہی فریضہ اُمّت کی طرف منتقل ہو گیا۔ چنانچہ سورۂ آلِ عمران میں ہے: کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ...... (۳/۱۰۹) "تم بہترین اُمّت ہو جسے نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ تمہارا فریضہ یہ ہے کہ تم معروف کا حکم دو اور منکر سے روکو"۔

اُمّت کا نمائندہ

ان حقائق سے واضح ہے کہ رسول اللہ کی جانشین درحقیقت پوری کی پوری اُمّت ہے۔ عملی انتظام کی سہولت کے لئے اُمّت اپنے میں سے بہترین فرد کو اپنا نمائندہ بنا کر اس سلسلہ کو قائم رکھتی ہے۔ اس طرح اُمّت میں "کتاب اور رسول" بدستور باقی رہتے ہیں۔ ان کی موجودگی میں اختلافات کے رونما اور فرقوں کے پیدا ہونے کا امکان ہی نہیں رہتا۔ چنانچہ تاریخ اس پر شاہد ہے کہ دورِ خلافت میں نہ کوئی اختلاف پیدا ہوا نہ کسی فرقے نے جنم لیا۔ اس لئے کہ اس دور میں کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ کسی اختلافی معاملہ کے تصفیہ کے لئے افرادِ اُمّت از خود فیصلہ کرنے بیٹھ گئے ہوں۔ اختلافی امور میں مرکزی اتھارٹی کی طرف رجوع کیا جاتا تھا۔ اور اس کے فیصلوں کی اطاعت سب پر لازم تھی۔ اسی اتھارٹی کو خلافت علیٰ منہاجِ نبوّت کہا جاتا ہے۔

ایک اہم سوال کا جواب

یہیں سے ہمیں اس سوال کا جواب بھی مل جاتا ہے جس کی طرف میں نے شروع میں اشارہ کیا تھا۔ یعنی یہ سوال کہ اُمّت ایک طریق پر قائم ہے۔ کچھ لوگ اس طریق سے اختلاف کر کے الگ فرقہ بنا لیتے ہیں، اس صورت میں اُمّت دو فرقوں میں بٹ گئی۔ جن لوگوں نے الگ فرقہ بنا لیا وہ تو یقیناً مجرم ہیں لیکن جو پہلے طریق پر قائم رہے انہیں تو مجرم نہیں قرار دیا جا سکتا۔ بالکل ٹھیک ہے۔ یہ ہے وہ دلیل جسے ہر فرقہ کی طرف سے یہ کہہ کر پیش کیا جاتا ہے کہ ہم حقیقی اسلام پر قائم ہیں اور الگ فرقے دوسروں نے بنائے ہیں لیکن ایسا کہنے میں اس حقیقت کو فراموش کر دیا جاتا ہے کہ جب تک "فِیْکُمْ رَسُوْلُہٗ" کی کیفیت رہے۔ یہ صورت جسے یوں بیان کیا جاتا ہے، پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ اس وقت اگر کوئی جماعت اُمّت سے اختلاف کرے گی تو رسولؐ کا جانشین قرآن کے اس حکم کے ماتحت کہ اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ وَکَانُوْا شِیَعًا

لَّسْتَ مِنْهُمْ فِىْ شَىْءٍ ...... (۶/۱۶۰) اس امر کا اعلان کر دے گا کہ اُمّت کو اس نئے فرقے سے کوئی سروکار نہیں۔ لہٰذا وہ اُمّت کا فرقہ کہلا ہی نہیں سکے گا۔ آسے مسلمانوں سے کچھ واسطہ ہی نہیں رہے گا۔ وہ اسلام کے دائرہ سے خارج ہوگا۔ اس لئے اُمّت، اُمّتِ واحدہ ہی رہے گی۔ یعنی خلافت علیٰ منہاجِ نبوّت میں، مسلمانوں میں کوئی فرقہ پیدا ہی نہیں ہو سکے گا۔

بہرحال یہ تھی وحدتِ اُمّت کی وہ عملی شکل جسے قرآن نے رسول اللہؐ کی وفات کے بعد تجویز کیا تھا۔ اور جسے حضورؐ کی وفات کے بعد اختیار کیا گیا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہ صورت قائم نہ رہی، خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی۔ سلاطین نے اپنی مصلحتوں کے ماتحت سیاست کو مذہب سے الگ کر لیا۔ اس یکسر غیر قرآنی تقسیم کی رو سے سیاست سے متعلق امور کے فیصلے بادشاہ خود کرتے تھے۔ باقی رہی شریعت، سو اس کے متعلق اس کے سوا کوئی صورت ہی نہ تھی کہ لوگ انفرادی طور پر فیصلے کرتے۔ اس ضمن ایک اور دشواری سامنے آئی۔ قرآن نے "اللہ اور رسول" کی اطاعت کا حکم دیا تھا۔ "اللہ اور رسول" کا جو مفہوم قرآنی نظام میں لیا جاتا تھا۔ اس مفہوم کی اب گنجائش ہی نہ تھی۔ اس لئے کہ اب وہ نظام ہی باقی نہ تھا۔ لہٰذا اب "اللہ اور رسول" کی اطاعت کا کوئی نیا مفہوم لیا جانا ناگزیر ہو گیا۔ اللہ کی اطاعت کے متعلق تو سمجھ لیا گیا کہ اس سے مراد کتاب اللہ کی اطاعت ہے، لیکن رسولؐ کی اطاعت کس طرح کی جائے، یہ سوال مشکل تھا۔ اس کے حل کے لئے اس کے سوا کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی کہ حضورؐ کی احادیث کی طرف رجوع کیا جائے۔ زمانہ خلافت میں چونکہ اطاعتِ رسول کا عملی مفہوم سامنے تھا۔ اس لئے احادیث کے جمع اور مرتب کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اب اس کی ضرورت پڑ گئی لہٰذا احادیث کے مجموعے مرتب کئے گئے۔ اب "اللہ اور رسول" کی اطاعت کا طریق یہ قرار پایا کہ قرآن اور حدیث کی رُو سے متنازعٌ فیہ امور کے فیصلے انفرادی طور پر کئے جائیں۔ ان انفرادی فیصلوں میں اختلاف ناگزیر تھا۔ اس لئے مختلف فرقوں کے نزدیک "قرآن اور حدیث" کے فیصلے مختلف ہو گئے۔ ان اختلافات کو مٹانے کے لئے مناظرے اور مباحثے شروع ہو گئے۔ اس کا جو نتیجہ نکلا وہ ہمارے سامنے ہے یعنی۔

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

چنانچہ آج حالت یہ ہے کہ اُمّت میں بیسیوں فرقے موجود ہیں۔ اور ہر فرقہ خدا اور رسول کی اطاعت کا مدعی اور حقیقی اسلام پر کاربند ہونے کا دعویدار ہے اور چونکہ اختلافات مٹانے والی کوئی زندہ اتھارٹی موجود نہیں۔ یعنی "فِيۡكُمۡ رَسُوۡلُهٗ" کی شکل باقی نہیں۔ اس لئے کوئی فیصلہ نہیں دے سکتا کہ کون غلط کہتا ہے اور کون صحیح۔

میرا خیال ہے کہ اب ہم اس مقام تک پہنچ گئے ہیں جہاں ہمیں اس سوال کا جواب از خود مل جائے کہ اُمّت میں وحدت پیدا کرنے کی شکل کیا ہے؟ اس کی شکل یہ ہے کہ جس نظام کے گم ہو جانے سے فرقہ بندی شروع ہوئی تھی، اس نظام کو پھر قائم کر دیا جائے۔ اس کے لئے پہلا قدم یہ ہے کہ اس فکر کو عام

کیا جائے کہ فرقوں کی موجودگی اور اسلامی زندگی دو متضاد چیزیں ہیں جو قرآن کی رُو سے ایک جمع نہیں ہو سکتیں اور فرقوں کو مٹا کر اسلامی زندگی پیدا کرنے کا طریق، قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاجِ نبوّت) کے قیام کے سوا کوئی نہیں۔ طلوعِ اسلام کے سامنے یہی مقصد ہے اور اسی کے حصول کے لئے یہ مصروفِ جدّوجہد ہے۔

لیکن اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ اب قرآنی نظام کے قیام کا کوئی امکان نہیں، تو اسے کم از کم اپنے آپ کو اس فریب میں مبتلا نہیں رکھنا چاہیئے کہ ہماری موجودہ زندگی اسلامی زندگی ہے۔ یا (فرقوں کے باوجود) اسلامی ہو سکتی ہے۔ مجھے اس کا احساس ہے کہ آپ اس حقیقت کو سامنے لانے کے لئے بآسانی تیار نہیں ہوں گے۔ آپ اسے کبھی تسلیم نہیں کرنا چاہیں گے کہ فرقوں کی موجودگی میں اسلامی زندگی میسر نہیں ہو سکتی۔ آپ کے نزدیک قابلِ قبول یہی مسلک ہوگا کہ تمام فرقوں میں سے ایک فرقہ حق پر ہے اس سے آپ کو یہ اطمینان حاصل ہو جاتا ہے کہ جس فرقے سے میں متعلق ہوں وہ حق پر ہے لہٰذا اس کے مطابق زندگی اسلامی ہے۔ جو نظریہ آپ سے اس اطمینان کو چھینتا ہے، وہ آپ کے نزدیک قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ آپ کو اس کے خلاف غصہ آئے گا لیکن آپ کا یہ غصہ خود قرآن کے خلاف ہونا چاہیئے جو فرقہ بندی کو شرک قرار دیتا ہے نہ کہ اس کے خلاف جو قرآن کی اس تعلیم کو آپ کے سامنے پیش کرتا ہے۔ یا تو آپ یہ کہیئے کہ یہ قرآن کی تعلیم نہیں اور اگر آپ اس کی تردید نہیں کر سکتے تو پھر آپ کے برافروختہ ہو جانے سے قرآنی حقیقت اپنی جگہ سے بدل نہیں جائے گی۔

یاد رکھئے! جب تک آپ اس تلخ حقیقت کو گوارا نہیں کر لیتے کہ فرقہ بندی کی زندگی قطعاً اسلامی زندگی نہیں، آپ قرآن کے بتائے ہوئے صراطِ مستقیم پر نہیں آ سکتے۔ قرآن کی رُو سے صراطِ مستقیم ایک ہی ہے۔ جب اُمّت مختلف راستوں پر چل نکلے تو پھر وہ صراطِ مستقیم کسی کے سامنے بھی نہیں رہتا۔ سورۂ انعام میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (۶/۱۵۳) یاد رکھو! میرا یہی ایک سیدھا راستہ ہے۔ تم سب اس کا اتباع کرو۔ اس کے سوا دوسرے راستوں پر نہ چلو۔ وہ راستے تمہیں اس صراطِ مستقیم سے متفرق اور پراگندہ کر دیں گے۔ اللہ نے تمہیں اس کا حکم دیا ہے تاکہ تم تقویٰ شعار رہ سکو۔"

(۰)

بات پھر پھرا کر وہیں آ گئی کہ

(۱) - فرقے صرف اسلامی نظام میں مٹ سکتے ہیں۔

(۲) - اسلامی نظام کے معنی ہیں ایک ایسی مملکت کا قیام جو قرآنی اصولوں کے مطابق وجود میں آئے اور جس کا تمام کاروبار قرآنی حدود و قیود کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پائے۔

(۳) اس مملکت کی طرف سے جو قوانین نافذ ہوں گے، ان کا اطلاق مملکت کے تمام مسلم باشندوں پر یکساں ہوگا۔ اس میں نہ کوئی فرقہ ہوگا نہ کسی فرقہ کی الگ فقہ۔ قرآن سب کا ضابطۂ قوانین ہوگا۔

قرائن بتا رہے ہیں کہ اس قسم کی قرآنی مملکت کے قیام کے لئے موجودہ مسلمان کبھی راضی نہیں ہوں گے کیونکہ یہ سب فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں اور کوئی فرقہ اپنی فقہ کو چھوڑنے پر آمادہ نظر نہیں آتا۔ اس سے آپ لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ہم (موجودہ مسلمانوں) میں نہ ایسا نظام قائم ہو سکتا ہے، نہ فرقے مٹ سکتے ہیں۔

اس کا عملی مفہوم یہی ہے کہ اسلامی نظام اُس قوم میں قائم ہو سکے گا جو مندرجہ بالا اصول کو تسلیم کرتے ہوئے اسلام لائے گی ... خواہ وہ موجودہ مسلمانوں میں سے ہوں اور خواہ پہلی بار اسلام لائے۔ قرآن کریم نے مسلمانوں کو بھی جو ایمان لانے کے لئے کہا ہے تو اس سے یہی مراد ہے۔ ارشاد ہے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِ ..... (۴/۱۳۶)

اے مسلمانو! تم، ایمان لاؤ اللہ پر، اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جسے خدا نے اپنے رسول پر نازل کیا تھا۔

یہ، از سرِ نو ایمان لانا درحقیقت، فرقہ وارانہ زندگی کو خلافِ اسلام تسلیم کر کے، قرآنی نظام کے قیام کی طرف پیش رفت کے لئے قدم اٹھانا ہے۔

یہ مرحلہ بڑا دشوار گذار نظر آتا ہے لیکن اس کے سوا احیاءِ اسلام کی کوئی صورت نہیں۔ اگر ہم اپنی موجودہ غیر اسلامی زندگی کو اسلامی کہہ کر اپنے آپ کو فریب دیتے ہیں، تو اس سے ہماری زندگی اسلامی نہیں ہو جائے گی۔ اسلامی زندگی کے لئے "اُمّتِ واحدہ" (جس میں کوئی فرقہ نہ ہو) بنیادی شرط ہے اور یہ صرف قرآنی مملکت میں ممکن ہے۔

نویدِ خوش آئند

شاہکارِ رسالت ایک نہایت بلند پایہ تصنیف ہے۔ بظاہر تو یہ خلافتِ حضرت عمرؓ کی داستانِ حیات آور ہے لیکن درحقیقت اس میں اسلام کا مکمل نظام گویا تابدار کی طرح نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اور آخری باب میں یہ عبرت آمیز حقیقت کہ اس کے بعد اسلام پر کیا بیتی اور اس کے اسباب و علل کیا تھے؛ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن بھی کچھ عرصہ سے نایاب تھا۔ بللہ الحمد کہ اب اس کا تازہ ایڈیشن شائع ہو گیا ہے۔ ضخامت ۵۸۴ صفحات۔ قیمت -/۷۵ روپے فی جلد۔ محصول ڈاک -/۷ روپے۔ ملنے کا پتہ

(۱) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور (۲) مکتبہ دین و دانش۔ چوک اردو بازار۔ لاہور

قرآن کا نام نہ لو!

یہ ایک حقیقت ہے بدیہی کہ مسلمان (تمام دنیا کے مسلمان) کمزور اور ناتوان ہیں اور اکثر اوقات ان کی یہ کمزوری، ذلت اور خواری کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ ہم کمیشن اور کمیٹیاں بٹھاتے ہیں یہ تحقیق کرنے کے لئے کہ ہمارے اس زوال کے اسباب کیا ہیں۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ اس زوال اور تباہی کے (متعدد) اسباب نہیں جن کی تحقیق کے لئے تمہیں کہیں دُور جانا پڑے۔ اس کا ایک ہی سبب ہے جو تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے لیکن تم اس پر سے آنکھیں بند کر کے گذر جاتے ہو۔ سورۂ محمدؐ میں ہے: وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَتَعْسًا لَّهُمْ وَاَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ..... (۴۷/۸) "جو لوگ صداقت سے انکار کرتے ہیں وہ تباہ و برباد ہو جاتے ہیں"۔ سوال یہ ہے کہ وہ کونسی صداقت ہے جس سے انکار کا نتیجہ ذلت و خواری ہے۔ فرمایا:۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ (۴۷/۹)

یہ ذلت و خواری اس لئے ہے کہ یہ لوگ خدا کی کتاب کو ناپسند کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کا سب کیا کرایا رائیگاں جاتا ہے۔

"كَرِهُوْا" (کراہت) کے معنی ہوتے ہیں کسی کام کو بامرِ مجبوری کرنا۔ یعنی دل تو اس پر راضی نہ ہو، لیکن اسے کسی مجبوری کے تحت ماننا یا کرنا پڑے۔ بادنیٰ تدبر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ یہ آیت غیر مسلموں کے متعلق نہیں، ہم (مسلمانوں) کے متعلق ہے۔ غیر مسلم تو کھلے بندوں اس کا انکار کرتے ہیں۔ ہم ہیں کہ قرآن کو دل کی رضامندی سے مانتے بھی نہیں، اور کھلے بندوں اس سے انکار کی جرأت بھی اپنے اندر نہیں پاتے۔ اسے مرتے بندوں مانتے ہیں ـــــ کافر توانی شد، ناچار مسلماں شو ـــــ اس نے ہماری اس حالت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:۔

وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا (۱۷/۴۶)

اور جب تو قرآن میں اکیلے خدا کا ذکر کرتا ہے تو ان کے دل میں نفرت کا طوفان اٹھتا ہے اور یہ پیٹھ پھیر کر چل دیتے ہیں۔

یہ خدائے واحد (اکیلے خدا) کی اطاعت کے تصور تک کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اس کے ساتھ انسانوں کو بھی شریک کرتے ہیں۔

وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ (۳۹/۴۵)

جب تو خدائے واحد کا ذکر کرتا ہے تو ان لوگوں کا دل پیچ و تاب کھاتا ہے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ لیکن جب اس کے سوا دوسروں کا ذکر کیا جاتا ہے تو بہت خوش ہوتے ہیں۔

انسانوں کو خدا کا ہمسر بنانا۔ ان کے فیصلوں کو خدائی شریعت قرار دینا، کھلا ہوا شرک ہے۔ فرمایا:۔

اَمۡ لَهُمۡ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوۡا لَهُمۡ مِّنَ الدِّيۡنِ مَا لَمۡ يَاۡذَنۡۢ بِهِ اللّٰهُ‌ؕ ...... (۴۲/۲۱)

کیا انہوں نے خدا کے شریک ٹھہرا رکھے ہیں جو ان کے لئے احکامِ شریعت وضع کرتے ہیں حالانکہ خدا نے ایسا کرنے کی کہیں اجازت نہیں دی۔

یہی ہیں وہ لوگ جو خدا پر ایمان رکھنے کے دعویدار ہونے کے باوجود مشرک کے مشرک رہتے ہیں۔ وَمَا يُؤۡمِنُ اَكۡثَرُهُمۡ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمۡ مُّشۡرِكُوۡنَ (۱۲/۱۰۶)

خدا کے ساتھ انسانوں کو شریک کرنے والوں کے متعلق وہ کہتا ہے:۔

اَوَلَمۡ يَكۡفِهِمۡ اَنَّاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ يُتۡلٰى عَلَيۡهِمۡ‌ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَرَحۡمَةً وَّذِكۡرٰى لِقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ (۲۹/۵۱)

(اے رسولؐ) کیا ان کے لئے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تیری طرف یہ کتاب نازل کی ہے، جس میں، ان لوگوں کے لئے جو اس کے خود مکتفی ہونے پر ایمان رکھتے ہیں، سامانِ شرف و رحمت ہے۔

یہ لوگ جو اس کے خود مکتفی ہونے پر ایمان رکھتے تھے، صدرِ اوّل کے مومن تھے۔ وہ اعلان کرتے تھے کہ حَسۡبُنَا كِتَابُ اللّٰهِ۔ "ہمارے لئے اللہ کی کتاب کافی ہے"۔ ان کے بعد وہ دور آیا جس میں اس قسم کے عقائد وضع ہوئے کہ، مِثۡلَهٗ مَعَهٗ، "قرآن کے ساتھ، قرآن کی مثل کچھ اور بھی ہے"۔ یہ "کچھ اور" روایات تھیں۔ ان سے کہا گیا کہ خدا نے تو وحی (ما انزل اللہ) کی اطاعت کا حکم دیا ہے، اور ما انزل اللہ (وحی) قرآن ہی ہے۔ جواب ملا کہ نہیں! وحی قرآن ہی میں نہیں ــــــ خارج از قرآن بھی ہے۔ وحی کی دو قسمیں ہیں۔ وحی متلو (جو قرآن میں ہے) اور وحی غیر متلو (روایات)۔ اس لئے روایات، قرآن کے ساتھ، قرآن کی مثل ہیں۔ اور ان کی اطاعت بھی اسی طرح دینی ہے جس طرح قرآن کی اطاعت۔ پہلے تو روایات اور قرآن دونوں کو ہمدوش قرار دیا۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ عقیدہ وضع کر دیا کہ روایات قرآن کو منسوخ کر سکتی ہیں۔ اس سے اصل اطاعت، روایات کی قرار پا گئی اور قرآن ان کے تابع ہو گیا۔ بعض روایات میں ایسا بھی آیا تھا کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میری طرف منسوب کردہ کوئی روایت اگر قرآن کے خلاف ہو تو اسے مسترد کر دو۔ وہ میرا قول ہو نہیں سکتا۔ جواب ملا کہ یہ حدیث زندیقوں کی وضع کردہ ہے رسول اللہؐ کی نہیں ہے۔ (اہلِ حدیث کا ترجمان، ماہنامہ الاعتصام، بابت ۲۳ جنوری سنہ ۱۹۷۰ء) جب قرآن اور حدیث میں تضاد ہو تو قرآن کی آیت کو منسوخ سمجھو۔

انہی روایات پر مبنی، فقہ کے احکام مرتب ہوئے، اور ان کے متعلق بھی یہ عقیدہ وضع ہوا کہ

ہر وہ آیت جو اس طریقہ کے مخالف ہو جس پر ہمارے اصحاب ہیں، وہ یا تو ماؤل ہے اور یا منسوخ۔ (فقہ حنفی کے مسلم امام، ابوالحسن عبید اللہ الکرخیؒ)

اس وقت سے لے کر آج تک، اسلام نام ہے روایات کی اطاعت یا فقہ کی اطاعت کا۔ قرآن محض تلاوت کے لئے رہ گیا ہے۔ اگر کوئی اس کی سند پیش کرتا ہے تو اسے گردن زدنی قرار دیا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ کی بات ہے، یہ بحث چھڑی کہ اسلام میں غلام اور لونڈیوں کی اجازت ہے یا نہیں۔ علامہ اسلم جیراجپوریؒ نے قرآن کریم سے ثابت کیا کہ اسلام میں اس کی قطعی ممانعت ہے۔ مودودی مرحوم نے روایات سے اس کا جواز پیش کیا اور یہ لکھا کہ

> مؤلف کی غلطی کا اصل سبب یہ ہے کہ انہوں نے صرف قرآن سے غلامی کا قانون اخذ کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ (تفہیمات حصہ دوم۔ صـ۲۹۲)

"صرف قرآن" سے دین کا قانون اخذ کرنا جرمِ عظیم ہے؛ اس لئے کہ

> رسول اللہ نے جو کچھ استاد کی حیثیت سے بتایا اور سکھایا ہے، وہ بھی اسی طرح خدا کی طرف سے ہے جس طرح قرآن خدا کی طرف سے ہے۔ اس کو غیر از قرآن کہنا صحیح نہیں۔ (تفہیمات۔ حصہ اول۔ صـ۳۳۶)

سابقہ جماعتِ اسلامی کے ایک دوسرے ذمہ دار رکن، مولانا امین احسن اصلاحی نے صاف صاف لکھ دیا کہ

> جو لوگ شریعت کو صرف قرآن کے اندر سمجھتے ہیں وہ کافر ہیں۔ (تسنیم۔ استقلال نمبر۔ ۱۹۵۲ء)

(۰)

قرآنی فقہ قابلِ تسلیم نہیں

اس سے پہلے تو پھر بھی (مسلمانوں کے عقیدہ کی رو سے) نظری طور پر ہی سہی، قرآن کو خارج از قرآن شرائع کے ساتھ رکھا جاتا تھا، لیکن اب جو "اسلامی جمہوریہ پاکستان" میں اسلامی احکام کے نفاذ کا عمل شروع ہوا ہے تو قرآن کو ان کے ساتھ بھی نہیں رکھا جاتا۔ اسے اس فہرست سے یک قلم الگ کر دیا گیا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی آپ کو ذیل کی خط و کتابت میں ملے گی۔ مدیر طلوع اسلام کی طرف سے، ۲۹ اکتوبر ۱۹۸۱ء کو ذیل کا خط ایڈمنسٹریٹر جنرل، سنٹرل زکوٰۃ ایڈمنسٹریشن کے نام بھیجا گیا۔

۲۹ اکتوبر ۱۹۸۱ء

محترمی۔ السلام علیکم!

میں آپ کی توجہ ایک نہایت اہم مسئلہ کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ قرآن کریم کی رو سے اس کے ڈانڈے کفر اور اسلام سے جا ملتے ہیں۔ بنابریں ہم متوقع ہیں کہ آپ اسے اپنی خصوصی توجہ کا مرکز قرار دے کر ہمیں اپنے جواب سے جلد مطلع فرمائیں گے۔

۲- زکوٰۃ آرڈیننس کی ترمیم مجریہ ۲۹ اکتوبر ۱۹۸۰ء میں کہا گیا ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو احکام زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دلانا چاہے، وہ ایک ڈیکلریشن داخل کرے جس میں تحریر ہو کہ وہ جس فقہ کا پابند ہے اس کی رُو سے وہ حکومت کے آرڈیننس کے مطابق زکوٰۃ ادا کرنے کا پابند نہیں۔ قارئینِ طلوعِ اسلام میں سے بعض احباب نے ڈیکلریشن داخل کیا جس میں لکھا کہ

> میں مسلمان ہوں اور قرآنی فقہ کا پابند۔ میں اپنے عقیدہ اور قرآنی فقہ کی رُو سے اپنے آپ کو حکومت کے آرڈیننس کے مطابق زکوٰۃ ادا کرنے کا مکلف نہیں پاتا، اس لئے مجھے ان احکام سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔

یہ حضرات (اور ہم خود) یہ سمجھتے تھے کہ "اسلامی جمہوریہ پاکستان" کی طرف سے اس ڈیکلریشن کو نہایت خندہ پیشانی سے خوش آمدید کہا جائے گا، لیکن ان احباب نے جو خطوط ہمیں بھیجے ہیں انہیں دیکھ کر ہمارے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ ان میں سے صرف دو ایک (زکوٰۃ وضع کرنے والی ایجنسیوں) نے اس ڈیکلریشن کو قابلِ قبول سمجھا ہے۔ باقی سب نے یہ کہہ کر مسترد کر دیا ہے کہ قرآنی فقہ مسلّمہ (RECOGNIZED) فقہ نہیں۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہوگا، "فقہ" احکام (یا JURISPRUDENCE) کو کہتے ہیں۔ گویا ان ایجنسیوں کے نزدیک، قرآنی احکام مسلّم نہیں ہیں۔ ان میں سے بعض نے، ڈیکلریشن داخل کرنے والوں سے یہ بھی کہا ہے کہ وہ بتائیں کہ قرآنی فقہ کے مسلّمہ ہونے کی اتھارٹی کیا ہے۔ بعض نے اس کے مسلّمہ ہونے کے لئے دستاویزی ثبوت طلب کیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس ثبوت کے لئے دو مفتیوں کے سرٹیفکیٹ پیش کئے جائیں۔

۳- چونکہ، جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے، اس سوال کا تعلق مملکتِ پاکستانیہ کی اساس و بنیاد سے ہے۔ اس لئے ہم ان جوابات پر جو ہمیں بالواسطہ موصول ہوئے ہیں، اکتفا اور انحصار نہیں کرنا چاہتے، ہم آپ سے براہِ راست دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا زکوٰۃ ، اڈمنسٹریشن قرآنی فقہ (احکام قرآنیہ) کو مسلّمہ تسلیم کرتی ہے یا نہیں۔

طلوعِ اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ کسی مذہبی فرقہ سے ـــ وہ قرآنِ کریم کو اُمّت کے لئے ضابطۂ حیات قرار دیتا ہے اور اس کی نشر و اشاعت اپنا دینی فریضہ جہاں اور جس گوشے سے بھی کوئی بات قرآن مجید کے خلاف اُٹھے وہ بحدِّ امکان اس کی مخالفت اور تردید کرتا ہے۔ یہی اس کا مسلک تحریک پاکستان کے زمانے میں تھا اور یہی مسلک تشکیلِ پاکستان کے بعد اب تک ہے۔ یہ اسی دینی ذمہ داری کا تقاضا ہے جس کی رُو سے ہم نے آپ سے اس امر کی وضاحت ضروری سمجھی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آپ غیر مبہم اور متعیّن الفاظ میں اس کی وضاحت فرمائیں گے اور ہمیں زیادہ عرصہ تک انتظار میں نہیں

رکھیں گے، کیونکہ اس باب میں ہمیں متعدد استفسارات موصول ہو رہے ہیں۔

بخدمت محترم۔
ایڈمنسٹریٹر جنرل
سنٹرل زکوٰۃ ایڈمنسٹریشن
منسٹری آف فائننس۔ اسلام آباد

والسلام
خیر طلب
محمد خلیل
مدیر طلوعِ اسلام

جب اس خط کا کوئی جواب موصول نہ ہوا، تو ۸ر جنوری ۱۹۸۲ء کو یاددہانی کا حسبِ ذیل خط بھیجا گیا۔

۸ - ۱ - ۱۹۸۲

محترمی - السلام علیکم!

میں نے اپنے عریضہ مورخہ ۲۹ر اکتوبر ۱۹۸۱ء میں دریافت کیا تھا کہ کیا زکوٰۃ ایڈمنسٹریشن قرآنی فقہ (احکامِ قرآن) کو مسلّمہ تسلیم کرتی ہے یا نہیں۔ اس کا کوئی جواب آپ کی طرف سے موصول نہیں ہوا۔ یہ عریضہ بطور یاددہانی ارسالِ خدمت ہے۔

۲۔ چونکہ، جیسا کہ میں نے اپنے عریضہ میں گزارش کیا تھا، اس سوال کا تعلق تمام ملّتِ پاکستانیہ سے ہے، اس لئے اگر آپ کا جواب ۱۸ر جنوری ۱۹۸۲ء تک موصول نہ ہوا، تو بامرِ مجبوری اس خط و کتابت کو پریس میں اشاعت کے لئے دے دیا جائے گا۔

تکلیف دہی کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ والسلام

نیاز آگیں
محمد خلیل
مدیر، طلوعِ اسلام

بخدمت محترم! ایڈمنسٹریٹر جنرل
سنٹرل زکوٰۃ ایڈمنسٹریشن
منسٹری آف فائننس۔ اسلام آباد

اس کا بھی ابھی تک کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ لیکن سنٹرل ڈائریکٹوریٹ، نیشنل سیونگز، اسلام آباد نے ایک استفسار کے جواب میں، سنٹرل زکوٰۃ ایڈمنسٹریشن کا حسبِ ذیل فیصلہ نقل فرمایا ہے:۔

زکوٰۃ اور عشر آرڈیننس، ۱۹۸۰ء (کی متعلقہ شق) کے مقصد کے لئے جو پانچ فقہیں تسلیم (RECOGNIZE) کی گئی ہیں، قرآنی فقہ ان میں شامل نہیں۔

یعنی انسانوں کی مدوّن کردہ فقہیں تو مسلّمہ ہیں لیکن خدا کی نازل فرمودہ فقہ قابلِ تسلیم نہیں!

اے محمدؐ اگر قیامت را برآری سر ز خاک　　سر برآر و ایں قیامت درمیانِ خلق بیں!

اللہ تعالیٰ نے تارکِ قرآن قوم (یعنی ہم مسلمانوں) کا نقشہ بڑے محاکاتی انداز میں کھینچا ہے۔ یوں سمجھئے کہ حشر کا میدان ہے۔ خدائے مقتدر، اپنے تختِ اجلال پر جلوہ فرما ہے۔ سامنے سے مختلف قومیں گذر رہی ہیں جن کا تعارف ان کے انبیائے کرامؑ کراتے ہیں۔ جب، ہماری سوختہ بخت قوم سامنے سے گذرتی ہے تو حضورؐ فریاد کناں فرماتے ہیں کہ

يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (۲۵/۳۰)

اے میرے پروردگار! یہ میری قوم ہے جس نے اس قرآن کو چھوڑ دیا تھا!

حضورؐ یہ نہیں فرمائیں گے کہ انہوں نے روایات یا فقہ کو چھوڑ دیا تھا۔ یہ فریاد کریں گے کہ انہوں نے قرآن کو چھوڑ دیا تھا!

(۰)

۲۔ کتاب و سنّت

ذیل کی خط و کتابت کا مطالعہ بھی فائدہ سے خالی نہیں ہوگا۔

مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۸۱ء کو ذیل کا خط محترم چیئرمین۔ وفاقی شرعی عدالت کی خدمت میں بھیجا گیا۔

۱۷-۱۱-۱۹۸۱

جناب محترم۔ السلام علیکم!

میں ایک اہم استفسار کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہوں۔ امید ہے آپ اس پر خصوصی توجہ فرمائیں گے۔

۲۔ وفاقی شرعی عدالت کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے (بلکہ اس کا بنیادی فریضہ ہے) کہ ملک کے مروّجہ قوانین میں سے جو قانون کتاب و سنّت کے خلاف ہو اسے غیر اسلامی قرار دے دے۔ بالفاظِ دیگر کسی قانون کے اسلامی ہونے کی شرط یہ ہے کہ وہ کتاب اور سنت دونوں کے مطابق ہو۔ سوال یہ ہے کہ اگر ایک قانون سنت کے مطابق لیکن قرآن کے خلاف ہو تو اس کی کیا پوزیشن ہوگی؟ اسے اسلامی قرار دیا جائے گا یا غیر اسلامی؟ یہ سوال اصولی ہے اور شرعی عدالت کا فیصلہ بھی اصولی ہی ہوگا۔ اس کی ایک بیّن مثال قانونِ وصیت ہے۔

۳۔ وصیت کے متعلق ارشادِ خداوندی ہے:۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۨ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ۝ (۲/۱۸۰ یعنی سورۃ بقرہ آیت ۱۸۰)

تم میں سے جب کوئی مرنے کے قریب ہو اور وہ کچھ مال اپنے پیچھے چھوڑ رہا ہو تو اس پر خدا کی طرف سے فرض قرار دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے والدین اور دیگر اقربا (میں سے جس کے لئے چاہے) معروف طریق سے وصیت کرے۔ یاد رکھو! ایسا کرنا متقین پر لازم ہے۔

اس ارشادِ خداوندی سے واضح ہے کہ

(۱) وصیت کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اور اس کی اہمیت اس سے واضح ہے کہ آیت کی ابتدا میں كُتِبَ عَلَيْكُمْ کہا گیا ہے اور آخر میں حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ۔

(۲) یہ نہیں کہا گیا کہ وصیت کرنے والا اپنے مال کے اتنے حصّہ کے لئے وصیت کر سکتا ہے۔ اس

سے زیادہ کے لئے نہیں۔ وہ اپنے پورے ترکہ کے لئے وصیت کر سکتا ہے۔

(۳) یہ بھی نہیں کہا گیا کہ وہ غیر وارثوں کے لئے وصیت کر سکتا ہے۔ وارثوں کے لئے نہیں۔ والدین اور اقربین" میں وارث اور غیر وارث سب آجاتے ہیں۔

(۴) کسی کو حق حاصل نہیں کہ اس کی وصیت میں کسی قسم کا ردّ و بدل کر سکے۔ فرمایا:۔

فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى الَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝ (۲/۱۸۱)

جو شخص اس وصیت کو سن کر اس میں کسی قسم کی تبدیلی کرے، تو اس کا گناہ تبدیل کرنے والوں پر ہوگا۔ یقیناً اللہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔

اس میں صرف اتنی گنجائش رکھی گئی ہے کہ

فَمَنْ خَافَ مِنْ مُوصٍ جَنَفًا أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝ (۲/۱۸۲)

اگر کوئی شخص محسوس کرے کہ وصیت کرنے والے نے حق و انصاف سے کام نہیں لیا اور وہ فریقین میں مصالحت کی کوشش کرے تو اس میں حرج کی بات نہیں۔ بیشک اللہ غفور و رحیم ہے۔

ظاہر ہے کہ مصالحت کی یہ کوشش، وصیت کرنے والے کی زندگی میں ہوگی۔ اگر وہ اس مصالحت کے نتیجہ میں اپنی وصیت میں کوئی تبدیلی کرنا چاہے تو فبہا۔ ورنہ اس کی وصیت برقرار رہے گی۔ آخری فیصلہ بہرحال اسی کا ہوگا۔

(۵) یہ جو کہا گیا ہے کہ وہ "معروف طریق سے وصیت کرے" تو اس معروف طریق کی وضاحت بھی خود قرآن کریم میں کر دی گئی ہے۔ سورۃ المائدہ کی آیات (۱۰۸-۱۰۶) میں بڑی تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ وصیت کس قسم کے گواہوں کے روبرو کی جائے گی۔

(۶) اگلا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ جب ترکہ کی تقسیم کے احکام دے دیئے گئے، تو ان کی موجودگی میں وصیت کی پوزیشن کیا ہوگی۔ اس کی وضاحت بھی خود اللہ تعالیٰ نے کر دی۔ تقسیم ترکہ کے احکام سورۃ النساء کی آیات ۱۲:۱۱ میں دیئے گئے ہیں، اور ہر مقام پر کہا گیا ہے مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ .... متوفی کا قرضہ ادا کرنے اور وصیت پوری کرنے کے بعد جو باقی بچے اس کی تقسیم اس طرح سے ہوگی۔ یعنی تقسیم ترکہ کے احکام وصیت پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہوں گے۔

---

(۰)

یہ ہیں وصیت کے متعلق قرآن کریم کے احکام ——— صاف اور واضح ——— جن کی رُو سے (۱) وصیت کرنا ہر مسلمان کے لئے فرض ہے۔ (۲) وصیت پورے ترکہ کے متعلق کی جا سکتی ہے۔

اور (۳) جس کے حق میں جی چاہے کی جا سکتی ہے۔

اس کے برعکس، موجودہ قانون یہ ہے کہ (۱) وصیت ایک تہائی (۱/۳) مال میں کی جا سکتی ہے۔ اور (۲) وہ بھی کسی وارث کے حق میں نہیں۔ اس قانون کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ حدیث پر مبنی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ دونوں قوانین ایک دوسرے کے خلاف ہیں۔ اور مروّجہ قانون سنّت کے مطابق ہے اور قرآن کے خلاف۔ لہٰذا کسی قانون کے اسلامی قرار پانے کے لئے جو دو شرائط لاینفک ہیں۔ یعنی وہ قرآن کے بھی مطابق ہو اور سنّت کے بھی مطابق ـــــ مروّجہ قانون ان میں سے صرف ایک شرط پوری کرتا ہے۔ یعنی یہ سنّت کے مطابق ہے۔ اور نہ صرف یہ کہ دوسری شرط پوری نہیں کرتا، یہ اس کے صریحاً خلاف ہے۔

سوال یہ ہے کہ مروّجہ قانونِ وصیت کے متعلق وفاقی شرعی عدالت کا کیا فیصلہ ہے؟ یہ اسلامی ہے یا غیر اسلامی؟

واضح رہے کہ، جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے، یہ سوال صرف قانونِ وصیت تک محدود نہیں۔ یہ ایک اصولی سوال ہے جس کا اطلاق ہر اس مروّجہ قانون پر از خود ہوگا جو قرآن کے خلاف ہو، بلا لحاظ اس امر کے کہ وہ سنّت کے مطابق ہے یا نہیں۔ ہمیں امید ہے کہ اس سوال کی اہمیت کے پیشِ نظر، شرعی عدالت اسے اپنی خصوصی توجّہ کا مستحق قرار دے گی، اور ہمیں اپنے فیصلہ سے جلد از جلد مطلع فرمائے گی۔ مروّجہ قوانین میں سے جو قوانین خلافِ قرآن ہونے کے باوجود، "اسلامی" قرار دیئے جاتے ہیں، ان کی تعمیل سے نہ صرف یہ کہ افراد اور قوم کو بے حد نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے بلکہ قوم، گناہِ عظیم کی مرتکب ہو رہی ہے۔ امید ہے کہ آپ اس سے متفق ہوں گے کہ خلافِ قرآن قوانین کو "اسلامی" سمجھنا بہت بڑا گناہ ہے!

والسلام!

آپ کی توجّہ کا منتظر: محمد خلیل
(ایم۔ ایم خلیل)
مدیر ماہنامہ طلوعِ اسلام

بخدمت گرامی! جناب چیئرمین۔
وفاقی شرعی عدالت
اسلام آباد

ـــــ (۰) ـــــ

۲۷ دسمبر ۱۹۸۱ء کو اس کا حسبِ ذیل جواب موصول ہوا۔

۲۷ دسمبر ۱۹۸۱ء

مکرمی جناب محمد خلیل صاحب، مدیر ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

بعد از اں عرض ہے۔ کہ آپ کی درخواست بابت وصیت مرسلہ ۱۷ نومبر ۱۹۸۱ء موصول ہوئی اس ضمن میں عرض ہے کہ چونکہ اس مسئلے کا تعلق شخصی قوانین سے ہے اور شخصی قوانین

پر بحث اس عدالت کے دائرہ اختیار سے باہر ہے۔ اس لئے آپ کی درخواست واپس کی جاتی ہے۔ والسلام

آپ کا مخلص

دستخط

(پروفیسر انوار اللہ)

ایڈوائیزر

وفاقی شرعی عدالت۔ اسلام آباد

اس کے جواب میں عرض کیا گیا:-

۸ - ۱ - ۱۹۸۲ محترمی۔ السلام علیکم!

آپ کا گرامی نامہ، نمبری FS-ع/(٢) 82/MIS مورخہ ۲۷ دسمبر ۱۹۸۱ء موصول ہوا۔ بصد معذرت عرض خدمت ہے کہ میرے سوال پر کما حقہٗ غور نہیں کیا گیا۔ آپ میرے عریضہ مورخہ ۱۲/۱۸/۸۱ کے پہلے پیرا میں دیکھیں گے کہ میرا اصولی سوال یہ تھا کہ

اگر ایک قانون قرآن کے خلاف اور سنّت کے مطابق ہو تو کیا اسے اسلامی قرار دیا جائے گا؟ (عریضہ واپسی ارسالِ خدمت ہے)

قانونِ وصیت میں نے بطورِ مثال پیش کیا تھا تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ میرا سوال محض نظری یا فرضی نہیں بلکہ ہمارے ہاں ایسے قوانین رائج ہیں جو قرآن کے خلاف اور سنّت کے مطابق ہیں۔

میں دوبارہ گذارش کرونگا کہ میرے اس اصولی سوال کا جواب مرحمت فرمایا جائے کہ اگر ایک قانون قرآن کے خلاف اور سنّت کے مطابق ہو تو اسے اسلامی قرار دیا جائے گا یا غیر اسلامی؟ وفاقی شرعی عدالت کے فیصلہ کا اطلاق خود بخود اس قسم کے جملہ قوانین پر ہو جائے گا۔ اس سے سوال کی اہمیت واضح ہے۔ والسلام

بصد اکرام

معذرت خواہ

محمد خلیل

(ایم ایم خلیل)

مدیر ماہنامہ طلوعِ اسلام

بخدمت گرامی جناب چیئرمین صاحب

وفاقی شرعی عدالت

(معرفت پروفیسر انوار اللہ صاحب) اسلام آباد

---(o)---

۲۸ جنوری ۱۹۸۲ء کو اس کا حسبِ ذیل جواب موصول ہوا۔

متفرق نمبر ۳(۸۲)/۸۱ منجانب۔ پروفیسر انوار اللہ۔ ایڈوائیزر

۲۸ جنوری ۱۹۸۲ء ۱۴۶/۱، مارگلہ روڈ، الف۔ ۶/۳، اسلام آباد

مکرمی جناب محمد خلیل صاحب! مدیر ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

السلام علیکم ۔۔۔۔ بحوالہ آپ کی درخواست مورخہ ۸/۱/۸۲ آپ کو مطلع کیا جاتا ہے کہ اگر آپ

کسی قانون کے متعلق جو کہ قرآن پاک میں موجود ہو اور آپ کے خیال میں حدیث شریف میں اس کی مخالفت ہو، پر فیصلہ چاہتے ہوں تو آپ موجودہ قوانین میں سے کسی ایسے قانون پر (سوائے وصیت کے قوانین کے) کی نشاندہی کرکے اس کے خلاف باقاعدہ شریعت پٹیشن دائر کرسکتے ہیں جو کہ عدالت ہذا کے قوانین کے مطابق ہو (نقل متعلقہ قوانین لف ہے) تاکہ عدالت ہذا اس پر مکمل غور و خوض کرکے فیصلہ صادر کرے۔ فقط والسلام

دستخط

(پروفیسر انوار اللہ) ایڈوائیزر
وفاقی شرعی عدالت۔ اسلام آباد

بملاحظہ۔ جناب محمد خلیل صاحب
مدیر ماہنامہ طلوع اسلام، ۲۵/بی گلبرگ لاہور

ہم کسی خاص قانون کی بات نہیں کر رہے تھے۔ ایک اصولی سوال کا اصولی جواب مانگ رہے تھے جو نہ ملا۔

(۰)

مشرک تو ہونا ہی پڑے گا!

محترم پرویز صاحب نے ذیل کا خط (مورخہ ۲۷ جون ۱۹۸۱ء) سیکرٹری صاحب، وزارتِ قانون، وفاقی حکومت کی خدمت میں بھیجا۔

محترمی! السلام علیکم

دستورِ پاکستان (۱۹۷۳ء) کے دو اہم نکات کی وضاحت کے لئے باعثِ زحمت ہو رہا ہوں۔ امید ہے آپ اسے گوارا فرمائیں گے۔

(۱) دستورِ پاکستان کی شق (آرٹیکل) (۱) ۲۲۷ میں کہا گیا ہے:-

تمام موجودہ قوانین کو ان اسلامی احکام کے مطابق وضع کیا جائے گا جو قرآن وسنت میں مذکور ہیں، اور کوئی ایسا قانون وضع نہیں کیا جائے گا جو ان احکام کے خلاف ہو۔

اس سے مترشح ہوتا ہے کہ کسی قانون کے اسلامی ہونے کی شرط یہ ہے کہ وہ قرآن وسنت کے مطابق ہو۔

سوال یہ ہے کہ اگر ایک قانون، قرآن کے خلاف لیکن سنت کے مطابق ہو، تو اس کی پوزیشن کیا ہوگی؟ اسے خلافِ اسلام قرار دیا جائے گا یا مطابقِ اسلام؟

اس کے برعکس، اگر کوئی قانون، قرآن کے مطابق ہو اور سنت کے خلاف، تو اس کی پوزیشن کیا ہوگی؟

(۲) صدارتی حکم ۱۴/۱۹۸۰ مجریہ ۱۸ ستمبر ۱۹۸۰ء کی رو سے، مندرجہ بالا آرٹیکل کی ترمیم ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

وضاحت:- جب ان قوانین کا اطلاق مسلمانوں کے کسی فرقہ کے پرسنل لاز (شخصی قوانین) پر ہوگا، تو قرآن وسنت سے مراد اس فرقہ کی تعبیر ہوگی۔

قرآنِ کریم فرقہ بندی کو شرک قرار دیتا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:۔

..... وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا ۖ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (۳۰/۳۱-۳۲)

مسلمانو! دیکھنا۔ تم (اسلام لانے کے بعد پھر سے) مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا، جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر لیا اور خود ایک فرقہ بن کر بیٹھ گئے۔ اس فرقہ بندی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر فرقہ اپنے اپنے عقائد اور مسلک میں مگن رہتا ہے (کہ وہ حق پر ہے)۔

حضورؐ نبی اکرم سے ارشاد ہوا:۔

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ۚ ... (۶/۱۶۰)

جن لوگوں نے دین میں تفرقہ پیدا کر لیا اور اپنا ایک الگ فرقہ بنا لیا۔ اے رسول! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔

اور جماعتِ مومنین سے تاکیداً کہا کہ

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ۚ ... (۳/۱۰۳)

تم سب یکجا ہو کر کتاب اللہ کو مضبوطی سے تھامے رہو، اور تفرقہ مت پیدا کرو۔

اگر ایک مسلمان، ان (اور ان جیسے دیگر کئی) ارشاداتِ خداوندی کی رُو سے، شرک سے مجتنب رہتا ہے اور کسی فرقہ (اور اس کی فقہ) سے وابستہ نہیں ہوتا بلکہ اپنے آپ کو صرف مسلمان کہتا ہے اور اس ارشادِ خداوندی کی رُو سے کہ

..... وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ ۝ (۵/۴۴)

اور جو کوئی خدا کی کتاب کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا، تو انہی لوگوں کو کافر کہا جاتا ہے۔

قرآنی احکام کو اپنے لئے سند سمجھتا ہے، تو شخصی قوانین کے سلسلہ میں اس کی پوزیشن کیا ہوگی؟ وہ "قرآن و سنت" کی جو تعبیر قرآن کی رُو سے کرے گا، کیا اسے اسلامی تسلیم کر لیا جائے گا؟ (۳) میرا خیال ہے کہ آپ مجھ سے متفق ہوں گے کہ یہ سوالات بڑے بنیادی اور اہم ہیں، اور ان کے متعلق دو ٹوک فیصلہ، قانون سازی اور نفاذِ قانون کے ضمن میں بہت سی پیچیدگیوں کو دُور کر دیگا۔ میں شکر گزار ہوں گا اگر آپ ان کے جوابات سے مجھے سرفراز فرمائیں گے۔ (۴) اگر ان سوالات کا تعلق کسی دوسری وزارت سے ہو، تو براہِ کرم میرے اس عریضہ کو ان کی طرف منتقل کر کے مجھے مطلع فرمائیں۔

شکریہ

بخدمت گرامی

محترم سیکرٹری صاحب۔ وزارتِ قانون

وفاقی حکومتِ پاکستان۔ اسلام آباد

والسلام

خیر طلب

غلام احمد پرویز

(چیئرمین قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی)

انہوں نے، ۲۸ اکتوبر ۱۹۸۱ء کو جواب دیا کہ چونکہ اس موضوع کا تعلق وزارتِ امورِ مذہبیہ سے ہے، اس لئے اس خط کو ان کے ہاں منتقل کر دیا گیا ہے۔ ان کی طرف سے کوئی جواب موصول نہ ہونے پر، ۴ نومبر ۱۹۸۱ء کو انہیں یاد دہانی کرائی گئی۔ اس پر بھی کوئی جواب موصول نہ ہوا تو انہیں مزید یاد دہانی کراتے ہوئے لکھا گیا کہ

چونکہ اس سوال کا تعلق پوری کی پوری ملّت سے ہے، اور مجھ سے دریافت کیا جا رہا ہے کہ اس خط و کتابت کا نتیجہ کیا نکلا، اس لئے، اگر آپ کی طرف سے جنوری کے اخیر تک کوئی جواب نہ آیا، تو مجھے مجبوراً اس خط و کتابت کو پریس میں دینا پڑے گا۔

اس کا بھی کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ شخصی قوانین کے متعلق فیصلہ کے لئے آپ کو، کسی نہ کسی فرقہ سے منسلک ہونا پڑے گا، (خواہ اسے آپ شرک ہی کیوں نہ سمجھیں) اگر آپ قرآن کے مطابق کوئی قدم اٹھائیں گے، تو وہ قانوناً واجب التسلیم نہیں ہوگا ——— خلافِ قانون قرار دیا جائے گا۔

فرقہ دارانہ فقہ کا فیصلہ واجب التسلیم ——— قرآن کے مطابق فیصلہ ناقابلِ تسلیم۔

اب بات سمجھ میں آئی کہ قرآن نے مسلمانوں سے بھی ایمان لانے کا مطالبہ کیوں کیا تھا جب کہا تھا کہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِ ..... (۴/۱۳۶) اے مسلمانو! تم ایمان لاؤ اللہ پر، اس کے رسول پر، اور اس کتاب پر جسے خدا نے اپنے رسول پر نازل کیا تھا۔

——— (۰) ———

اگر ان کی طرف سے کوئی جواب موصول ہوتا تو ان سے مزید دریافت کیا جاتا کہ

(۱) یہ جو اسلامی قوانین کو "شخصی و ملکی" میں تقسیم کیا گیا ہے تو اس کی سند (اجتہاد؟) کیا ہے؟ اس قسم کی تقسیم نہ تو قرآن کریم میں ہے، اور نہ ہی عہدِ رسالتمآبؐ میں اس کا کوئی نشان ملتا ہے۔ گویا یہ تقسیم قرآن و سنت دونوں کے خلاف ہے۔ اس کے باوجود اسے اس دستور میں شامل کر دیا گیا ہے جس کے سرِعنوان لکھا ہے کہ کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف وضع نہیں کیا جائے گا!

(۲) یہ جو کہا گیا ہے کہ "ہر فرقہ اپنی اپنی فقہ کے مطابق تعبیر کریگا" تو ان فرقوں کی کوئی فہرست مرتب کی گئی ہے، اور اس کے لئے سند کونسی ہے؟

لیکن جن کی طرف سے کوئی جواب ہی نہ ملے، ان سے سوال کیا کیا جائے؟ اس سعیِ لاحاصل کے باوجود ہم نے اس خط و کتابت کو طلوعِ اسلام کے صفحات میں اس لئے محفوظ کر دیا ہے کہ (کم از کم) آنے والے مؤرخ کو اتنا تو معلوم ہو جائے کہ اس دور میں کہیں سے قرآن کی آواز بھی بلند ہوتی تھی۔

——— (۰) ———

رابطۂ باہمی

بزمہائے طلوعِ اسلام کے حلقہ میں دو تازہ بزموں کا اضافہ ہوا ہے جن کا اعلان بمسرت کیا جاتا ہے۔

(۱) خانیوال میں "قرآنی احباب"، بالخصوص محترم عبدالستار قادری اور پروفیسر اے۔ آر صیغم کی مساعیٔ جمیلہ سے بزم کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ اراکین نے پروفیسر ضیغم صاحب کو اپنا نمائندہ منتخب کیا ہے۔ پتہ ان کا حسبِ ذیل ہے۔

مکان نمبر ۵۴/۱۴ ۔ حکیم آباد۔ سول لائینز۔ خانیوال

(۲) دہاڑی میں احبابِ قرآنی، بالخصوص ماسٹر نور احمد صاحب کی کوششوں سے بزمِ طلوعِ اسلام قائم کی گئی ہے۔ محترم خالد صدیق صاحب اس کے نمائندہ منتخب ہوئے ہیں۔ پتہ ان کا مکان نمبر ۲۰/سی دہاڑی ہے۔

ادارہ ان دونوں بزموں کے قیام کی توثیق اور ان کے منتخب نمائندوں کی تصویب کرتا ہوا دست بدعا ہے کہ اللہ تعالیٰ جملہ ارکان کو اس کی توفیق عطا فرمائے کہ وہ قرآنی فکر کی نوری کرنوں کو دُور دُور تک پھیلا سکیں۔

نظامِ ربوبیّت

آپ ایک عرصہ سے سنتے چلے آرہے ہیں کہ اسلام، نہ نظامِ سرمایہ داری کا حامی ہے نہ کمیونزم کا۔ اس کا اپنا منفرد معاشی نظام ہے۔ جس میں نوعِ انسان کی مشکلات کا حل مضمر ہے۔ لیکن کسی نے یہ نہ بتایا کہ اسلام کا وہ معاشی نظام ہے کیا؟

(یہ پہلے ایڈیشن سے کہیں مختلف ہے) مفکرِ قرآن، پرویز صاحب کی اس تصنیف میں نہایت وضاحت سے بتایا گیا ہے کہ

(۱) نظامِ سرمایہ داری کیا ہے؟ کمیونزم اور سوشلزم کے نظام کیا ہیں۔ اور یہ کیوں ناکام رہ گئے ہیں اور ان کے برعکس (۲) اسلام کا وہ معاشی نظام کیا ہے جو نوعِ انسانی کی مشکلات کا اطمینان بخش حل پیش کرتا ہے ——— اس کتاب کے بعد آپ کو معاشیات کے موضوع پر کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں رہے گی۔

* کتاب آفسٹ کی چھپائی میں ولائتی سفید کاغذ پر طبع ہوئی ہے ——— ضخامت ساڑھے چار سو صفحات ——— سنہری جلد ——— قیمت فی جلد پچاس روپے علاوہ محصول ڈاک

رشتہ مطلوب ہے

فوج میں ملازم جونیئر کمشنڈ آفیسر (نائب صوبیدار) عمر قریب تیس سال تعلیم میٹرک مستقل رہائش دیہاتی۔ آجکل بصیغۂ ملازمت راولپنڈی میں تعینات ہیں۔ ان کے لئے ایک ایسی لڑکی کا رشتہ درکار ہے جس کی تعلیم تو خواہ زیادہ نہ ہو لیکن وہ قرآنی فکر کے سمجھنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ خط و کتابت (جو بصیغۂ راز رہے گی)۔

م ت ع۔ (معرفت ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور) کی جائے۔

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

جسے مقامی بزم ہائے طلوعِ اسلام کے اہتمام سے ہفتہ وار یا ماہانہ، کیسٹ یا ٹیپ ریکارڈرز کے ذریعے حسبِ ذیل مقامات اور اوقات پر باقاعدگی کے ساتھ نشر کیا جاتا ہے :۔

نوٹ :۔ پرویز صاحب کے درس کے دوران ہی متعدد کیسٹیں اور بیرونی بزموں کے لئے ریکارڈ کر لئے جاتے ہیں۔

نام بزم طلوع اسلام	دن اور وقت	مقام درس کے کوائف :۔
لاہور	جمعہ کو ۹ بجے صبح	۲۵/بی گلبرگ نمبر ۲ (نزد پولیس سٹیشن) فون نمبر ۸۸۰۸۰۰
لندن (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار [illegible]	149 SUTTON COURT RD. LONDON (E-13-9NR) PHONE-01-552-1517
برمنگھم (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار دو بجے دوپہر	(بمقام) 60, HERICK RD SALTLEY, B8 INT.
اوسلو (ناروے)	ہر ماہ کا پہلا سنیچر شام ۶ بجے	(بمقام) MR MANZOOR AHMAD, DOVRE GATE-7/OSLO-1
ٹورنٹو (کینیڈا)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۱۰ بجے صبح	335 DRIFTWOOD AVE. #311, DOWNS VIEW. TORONTO (NORTH YORK) (ONT): M3N-2P3. PHONE (416) 661-2827
کراچی نمبر ۲	ہر جمعہ کو ۹ بجے صبح	کتب خانہ بزم طلوع اسلام کمرہ نمبر ۲۴ ہارڈن چیمبرز۔ الطاف حسین روڈ نیو چالی۔ فون نمبر ۲۳۸۸۲۸
پشاور	(۱) ہر جمعہ ۵ بجے شام (۲) ہر جمعہ ۹ بجے صبح	(۱) رہائش گاہ آغا محمد یونس صاحب۔ رفیقی لین صدر (OPP: VIR MANGATE) پشاور سٹیڈیم بالمقابل روڈ۔ فون ۷۴۶۵۹ (۲) ہوٹل نعمت کدہ۔ یونیورسٹی روڈ۔ جہانگیر آباد۔
مردان	ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح	عبداللطیف۔ محمود علی صاحب۔ اکاخیل بلڈنگ نواب علی روڈ
راولپنڈی	ہر جمعہ ۵ بجے شام	جی ۔ ۱۶۶ لیاقت روڈ
لیہ	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	شبیر میکینیکل انجینئرنگ ورکس ۔ مشید روڈ (لیہ)
ایبٹ آباد	ہر جمعہ ۴ بجے شام	رہائش گاہ صلاح الدین صاحب۔ واقع 234-K-L کہپال (ایبٹ آباد)
سرگودھا	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	چوک واٹر سپلائی مکان نمبر ۲۔ نظامی منزل
بہاولپور	ہر جمعہ ۸ بجے صبح	عثمانی خیراتی شفاخانہ غنی پورہ باہتمام (ڈاکٹر ہومیو) محمد اعظم خان صاحب۔
چکوال	ہر جمعہ کو ۹ بجے صبح	ضیا ٹیوشن سنٹر نزد ہجویری مسجد با اہتمام ماسٹر غلام حسین صاحب نمائندہ بزم طلوع اسلام۔
کوئٹہ	باقاعدہ ہفتہ وار	رابطہ کے لئے ریڈیو اینڈ الیکٹرک سنٹر، ترغی روڈ۔ باہتمام غلام صابر صاحب
گوجرانوالہ	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم ملحق رہائشگاہ :۔ چوہدری مقبول شوکت۔ گل روڈ۔ سول لائنز
گجرات	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ و ہر اتوار ۲ بجے دوپہر	بمقام ۔ ۱۲/۱/بی ۔ کچہری روڈ ... باہتمام شیخ قدرت اللہ صاحب ایڈووکیٹ
جلالپور جٹاں	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم طلوع اسلام (بازار کلاں)
ملتان	ہر جمعہ ۹ بجے صبح	دفتر شاہ سنز بیرون پاک گیٹ (فون ۳۱۰۷۱)
پنجکسی (تحصیل کبیروالا ملتان)	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	بمقام۔ مطب حکیم احمد الدین صاحب (نمائندہ بزم)
ہنگو	ہر جمعہ کو ۵ بجے شام	رہائش گاہ محمد جمیل صاحب واقع ریلوے روڈ (فون نمبر ۶۷)
فیصل آباد	ہر جمعہ کو ۳ بجے بعد دوپہر	بمقام۔ حیات سرجیکل کلینک ۲۳/۲ پیپلز کالونی نمبر ۱ (فون ۴۲۵۵۵)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وقت کا اہم ترین سوال

اِسلامی نظامِ حکومت

کس قسم کا ہوگا؟

اسلامی نظامِ حکومت

آجکل اس سوال کا چرچا عام ہو رہا ہے کہ اسلامی مملکت کے نظام حکومت کا ڈھانچہ کس قسم کا ہوگا۔ اس سلسلہ میں حکومت کی طرف سے کوئی سوالنامہ بھی جاری ہوا ہے۔ ہمیں وہ سوالنامہ تو موصول نہیں ہوا لیکن قرآنی فکر سے دلچسپی رکھنے والے احباب کی طرف سے ہمیں کہا جا رہا ہے کہ یہ ضروری ہے کہ قرآن مجید کی روشنی میں اس ڈھانچے کے خط و خال نمایاں کئے جائیں۔ یہ سطور انہی تقاضوں کی تعمیل میں سپردِ قلم کی جا رہی ہیں۔

قرآن کریم کی رُو سے اسلامی مملکت قرآنی قوانین کی حکمرانی کا نام ہے۔ اس لئے اس باب میں پہلا اور بنیادی سوال قانون سازی کا ہوگا۔ ہم پہلے اسی سوال کو لیتے ہیں۔ بعد میں بتایا جائیگا کہ ان قوانین کے وضع اور نافذ کرنے کی مشینری کس قسم کی ہوگی۔ اسی کو اسلامی حکومت کہا جائے گا۔

(۱)

انسان فطرتاً مدنی الطبع واقع ہوا ہے جس کی وجہ سے اس کے لئے مل جل کر رہنا ضروری ہے۔ انفرادی زندگی میں (یعنی جہاں ایک فرد تنہا زندگی بسر کرے) کوئی تصفیہ طلب معاملہ پیدا نہیں ہوتا لیکن اجتماعی زندگی میں اس قسم کے معاملات کا نمودار ہونا ناگزیر ہے۔ جب دو انسانوں میں کوئی نزاع پیدا ہو جائے تو اس کے لئے کسی ثالث کی ضرورت ہوتی ہے جو ان کے متنازع فیہ معاملہ میں تصفیہ کرے۔ جو صورت دو افراد میں پیدا ہو سکتی ہے، وہ عام معاشرہ میں بھی پیدا ہوتی ہے۔ اس کے لئے بھی کسی ثالث کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس ضرورت کے پورا کرنے کے لئے انسانوں نے اپنے لئے ایک نظام وضع کیا جسے نظامِ حکومت کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اس کی ابتدائی شکل تو قبائلی یا پنچایت کی سی تھی لیکن اس کے بعد جب اس نے وسعت اختیار کر لی تو کسی باقاعدہ ثالث کی ضرورت پیش آئی۔ اس ثالث کو حاکم کہہ کر پکارا گیا یعنی فیصلہ کرنے والا۔ اسے شخصی حکومت کہتے ہیں۔ یعنی وہ حکومت جس میں ایک فرد کا حکم قولِ فیصل قرار پایا جاتا تھا اور اس کی نافرمانبرداری مستوجبِ سزا ہوتی تھی۔ بالفاظِ دیگر اس میں جملہ افرادِ معاشرہ اپنے ہی جیسے ایک انسان کے محکوم ہوتے تھے۔ انسانی تمدنی زندگی آگے بڑھی تو احکام کی جگہ قانون کا تصور پیدا ہوا۔ احکام اور قانون میں فرق یہ تھا کہ حکم تو وقتی ہوتا تھا لیکن قانون سے مراد یہ تھی کہ جب تک اسے بدلا نہ جائے وہ کارفرما رہے۔ اس وقت سوال یہ پیدا ہوا کہ اس قسم کے قوانین کون وضع کرے۔ قانون کی حکمرانی کے زمانہ میں یہ جو ہم نظامِ حکومت کی مختلف شکلیں دیکھتے ہیں تو یہ درحقیقت انسان کی اسی کوشش کے مختلف مظاہروں کا نام ہے جس کی رُو سے وہ طے کرتا تھا کہ قانون سازی کے اختیارات کسے حاصل ہونے چاہئیں۔ اس کی آخری شکل نظامِ جمہوریت ہے۔ لیکن عہدِ کہن کی شخصی حکومت ہو یا عصرِ حاضر کی جمہوریت، اس میں انسان بہرحال اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کے فیصلوں کا محکوم رہتا ہے۔

۲۔ انسان کی ان تمام کوششوں کے برعکس اللہ تعالیٰ نے ایک دین عطا فرمایا جس کی بنیاد احترامِ انسانیت اور شرفِ آدمیت پر تھی۔ اس نے کہا کہ ہر انسان، انسان ہونے کی جہت سے یکساں واجب التکریم ہے۔

قرآن کا انقلابی تصور

اس لئے یہ چیز شرفِ انسانیت کے منافی ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم ہو۔ وہ ایک انسان ہو یا انسانوں کا کوئی گروہ، وہ کسی کا حکم ہو یا انسانوں کا وضع کردہ قانون۔ بات ایک ہی ہے۔ اس میں انسان دوسرے انسانوں کا محکوم ہوتا ہے اور یہ چیز احترامِ آدمیت کے منافی ہے۔ اس نے یہ انقلاب آفریں اعلان کیا کہ:

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ

كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ..... (۳/۷۹)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں — خواہ اسے ضابطۂ قوانین، اختیارِ حکمرانی، حتیٰ کہ نبوت بھی کیوں نہ حاصل ہو کہ وہ دوسرے انسانوں سے کہے کہ تم اللہ کے نہیں بلکہ میرے محکوم بن جاؤ۔

اس آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے، کسی انسان کو نہیں، خواہ وہ شخصی حکومت کی شکل میں ہو اور خواہ قانون سازی کے اداروں کی صورت میں۔ حتیٰ کہ نبی تک کو بھی اس کا حق حاصل نہیں۔ شرفِ انسانیت کا تحفظ اسی صورت میں ممکن ہے کہ حکم دینے یا قانون صادر کرنے کا حق انسانوں سے بالا کسی ہستی کو ہو۔ اس ہستی کو اللہ کہا جاتا ہے۔ جو لوگ اس حقیقت کو تسلیم کر لیں انہیں مؤمن — یعنی خدا پر ایمان لانے والے کہہ کر پکارا جائے گا۔ بالفاظ دیگر ایمان باللہ کا بنیادی مفہوم یہ ہے کہ حقِ حکومت کسی انسان کو حاصل نہیں صرف خدا کو حاصل ہے۔

کتاب اللہ کی حاکمیت

اس ایمان باللہ کے بعد لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نہ ہمیں کہیں دکھائی دیتا ہے نہ وہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ نہ ہم اپنے کانوں سے اس کی بات سن سکتے ہیں تو اس کے احکام کی اطاعت کس طرح کی جائے؟ اس کا جواب خدا نے اسی آیت ..... میں دے دیا جس کا آدھا حصہ ہم نے اوپر درج کیا ہے۔ اس کا باقی حصہ یوں ہے :-

وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (۳/۷۹)

نہیں کسی انسان کی محکومیت اختیار نہیں کرنی چاہیئے۔ محکومیت صرف خدا کی اختیار کرنی چاہیئے اور اس کا ذریعہ وہ کتاب ہے جسے اس نے نازل کیا ہے۔ جسے تم پڑھتے پڑھاتے ہو اور جس کے احکام و مطالب تم اپنے دل و دماغ میں جاگزیں کرتے ہو۔

آپ غور کیجئے کہ قرآن کریم نے کیسے بلیغ انداز سے اس بات کو سمجھا دیا کہ خدا کی محکومیت اختیار کرنے کا قابلِ عمل طریقہ کیا ہے۔ آپ غور کیجئے کہ آج، اس دور میں، جسے انتہائی تہذیب و تمدن کا زمانہ کہا جاتا ہے، مبنی بر عدل حکومت کا تصور یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے ایک آئین مرتب کرتی ہے۔ اس آئین کو کتاب کی شکل میں شائع کیا جاتا ہے۔ پھر اس آئین کے مطابق قوانین وضع کئے جاتے ہیں اور وہ قوانین بھی کتابوں کی شکل میں عام کئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ہر متنازعہ فیہ معاملہ کے تصفیہ کے لئے ان کتابوں کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر حکمرانی کتاب کی ہوتی ہے۔ کتاب کی حکمرانی میں کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ وہ لوگ کہاں ہیں جنہوں نے اس کتاب کو مرتب کیا تھا۔ وہ ہمارے سامنے کیوں نہیں آتے۔ ہم ان کی کوئی بات نہیں مانیں گے جب تک وہ ہمیں خود حکم نہ دیں۔ کوئی اس کا تقاضا نہیں کرتا۔ غور کیجئے کہ قرآن کریم نے یہ بات چودہ سو سال پہلے کہی تھی کہ حکمرانی کتاب (ضابطۂ قوانین) کی ہوتی ہے اور اس کی موجودگی میں اس کی ضرورت نہیں رہتی کہ صاحبِ کتاب خود ہمارے سامنے آکر حکم دے تو پھر ہی اس کی اطاعت کی جائے۔ کتاب کی اطاعت درحقیقت کتاب دینے والے کی اطاعت ہوتی ہے۔ لہٰذا، اللہ کی اطاعت کی عملی شکل اس کی کتاب کی اطاعت ہے، اور اللہ پر ایمان کا عملی مفہوم اُس کی کتاب پر ایمان لانا ہے۔ جو شخص خدا کی کتاب پر ایمان نہیں لاتا، اس کا خدا پر ایمان لانا بھی قابلِ تسلیم نہیں ہو سکتا۔ اور جو شخص اس کی کتاب کی محکومیت اختیار نہیں کرتا وہ خدا کی حاکمیت سے انکار کرتا ہے۔ یہ وجہ ہے جو اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ :

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۔ (۵/۴۴)

جو لوگ خدا کی کتاب کی محکومیت اختیار نہیں کرتے وہ مؤمن نہیں کافر کہلاتے ہیں۔

(۳) جس کتاب کی محکومیت اختیار کی جانی مقصود ہو یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ اپنی ہر بات کو واضح طور پر بیان کرے۔ اس میں کوئی ابہام نہ ہو۔ کسی قسم کا التباس نہ ہو۔ اللہ تعالےٰ نے اپنی کتاب کی اس خصوصیت کو مختلف مقامات پر واضح کر دیا۔ مثلاً سورۃ النحل میں ہے :۔

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ .... (۱۶/۸۹)

اے رسول! ہم نے تم پر ایک ایسی کتاب نازل کی ہے جو اپنی ہر بات کو نہایت وضاحت سے بیان کر دیتی ہے۔

(۴) خدا کی اس محکومیت کا سلسلہ تو شروع سے جاری تھا لیکن چونکہ اُن (ابتدائی) ادوار میں نہ انسانی ذہنوں میں ہنوز پختگی آئی تھی، نہ ان کے علم اور تجربہ میں وسعت پیدا ہوئی تھی، اس لئے انہیں زیادہ تر وقتی اور عارضی احکام دیئے جاتے تھے۔ یہ وجہ تھی کہ ان کی طرف جلدی جلدی رسول بھیجے جاتے تھے اور ان رسولوں کا دائرہ کار بھی محدود ہوتا تھا۔ جب مشیت کے پروگرام کے تحت انسانیت پختگی کے دور میں پہنچ گئی (یوں کہیئے کہ جب بچہ جوان ہو گیا) تو خدا کی طرف سے ایک ایسا ضابطۂ آئین و قوانین نازل کر دیا گیا جو عالمگیر انسانیت کے لئے بھی کافی ہو اور آنے والے تمام زمانوں کے تقاضوں کو بھی محیط ہو۔ وہ ہر طرح سے مکمل ہو اور اس میں کسی تغیر و تبدل کی ضرورت نہ پڑے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو نازل کر دینے کے بعد فرمایا کہ :۔

آخری کتاب

وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ .... (۶/۱۱۵)

تیرے رب نے جو کچھ انسانوں سے کہنا تھا، اسے اس کتاب میں مکمل کر دیا گیا ہے۔ نیز اس میں مندرج قوانین میں کسی قسم کے تغیر و تبدیل کی بھی ضرورت نہیں ہو گی۔ اس لئے کہ یہ ضابطۂ قوانین اس خدا کی طرف سے نازل کردہ ہے جو سب کچھ سنتا اور سب کچھ جانتا ہے۔

یعنی اس ضابطۂ قوانین میں نہ کسی اضافے کی ضرورت ہو گی اور نہ ہی کسی قسم کے تغیر و تبدل کی۔ اس کے بعد ایک ہی سوال باقی رہ جاتا تھا کہ اگر کسی وقت یہ کتاب حوادثِ ارضی و سماوی سے ناپید ہو گئی، یا اس میں کسی نے تحریف کر دی، تو پھر کیا صورت ہو گی۔ فرمایا کہ اس کا امکان ہی نہیں، اس لئے کہ :

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۔ (۱۵/۹)

ہم نے ہی اس کتاب کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمے دار ہیں۔ اس میں نہ تحریف ہو سکے گی اور نہ ہی یہ ضائع ہو گی۔

یعنی قرآن مجید خدا کا مکمل ضابطۂ قوانین ہے جس میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کی ضرورت پیش نہیں آئے گی اور یہ غیر محرف بھی رہے گا اور محفوظ بھی۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی کتاب کے بعد خدا کی طرف سے کسی رسول کے آنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی — ختمِ نبوت اس کا لازمی اور قطعی نتیجہ تھا۔

(۵) ہم نے دیکھا ہے کہ دین، مذہب کی طرح خدا اور بندے کے درمیان کسی پرائیویٹ عقیدے کا نام نہیں جو انسانوں

کے خود ساختہ تصور کی رو سے پوجا پاٹ، بھگتی یا پرستش کے ذریعے قائم ہو سکتا ہے۔ دین انسانوں کی اجتماعی نظامِ زندگی کا نام ہے۔ جس میں خدا کی کتاب کی حکومت اختیار کی جائے۔ جب ہم نظامِ زندگی یا حاکمیت اور حکومت کے الفاظ بولتے ہیں تو اس سے لازماً ایک نظامِ حکومت یا مملکت کا تصور سامنے آتا ہے۔ مملکت کے بغیر کسی کتاب کی حکومت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس

مملکت کی ضرورت

حقیقت کو قرآنِ مجید نے یہ کہہ کر خود واضح کر دیا کہ دین کا تمکن اسی صورت میں ممکن ہے جب دین کے ماننے والوں کو ملک میں تمکن حاصل ہو۔ سورۃ النور میں ہے:۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ۔ (۲۴/۵۵)

جو لوگ اللہ پر ایمان لائیں گے اور صلاحیت بخش کام کریں گے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ انہیں زمین میں اقتدار عطا کرے گا جس طرح اقوامِ سابقہ کی صورت میں کیا گیا تھا تاکہ اس طرح وہ دین متمکن ہو سکے جسے اس نے ان کے لئے منتخب کیا ہے۔

اس سے واضح ہے کہ جماعتِ مؤمنین کی اپنی آزاد مملکت کے بغیر دین کا تمکن ممکن ہی نہیں۔ بات بالکل واضح ہے۔ دین کے تمکن کے معنی ہیں کتاب اللہ کی حکومت قائم ہونا اور حکومت لامحالہ اپنی آزاد مملکت ہی میں قائم ہو سکتی ہے! — آج کی اصطلاح میں یوں سمجھئے کہ آئینِ پاکستان اسی صورت میں کارفرما ہو سکتا ہے جب مملکتِ پاکستان موجود ہو۔

ضمناً، مندرجہ بالا آیت سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ جس مملکت میں دین کا تمکن مقصود ہو، وہ ظلم اور استبداد، دھاندلی اور سلب و نہب سے حاصل نہیں کی جاتی۔ وہ خدا کی حاکمیت پر ایمان اور اس کے مطابق صلاحیت بخش پروگرام کی رو سے حاصل ہوتی ہے۔ بہرحال ہم کہہ یہ رہے تھے کہ دین کا تمکن — یعنی کتاب اللہ کی حکومت — اپنی آزاد مملکت ہی میں ممکن ہے۔ سورہ الحج میں ہے:۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ — (۲۲/۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں ملک میں اقتدار حاصل ہوگا تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کریں گے جن امور کو کتاب اللہ نے جائز قرار دیا ہے انہیں تھمتا نافذ کریں گے۔ جنہیں اس نے ناجائز ٹھہرایا ہے ان پر پابندی عائد کریں گے۔ مختصراً یہ کہ ان کا ہر معاملہ انجام کارِ خدا کے قوانین کے مطابق طے پائے گا۔

اس مقام پر ایک بڑا اہم اور غور طلب نکتہ سامنے آتا ہے۔ ہمارے مفسرین نے قرآنِ مجید کی سورتوں کو مکی اور مدنی حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ہم ان کے معیارِ تقسیم کے متعلق تو سرِدست کوئی بات نہیں کرنا چاہتے لیکن اس اہم حقیقت کو سامنے لانا چاہتے ہیں کہ مکی آیات کی سورتوں میں کہیں "یٰاَیُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا" (اے جماعتِ مومنین) نہیں آیا..... یٰاَیُّهَا النَّاسُ۔ (اے لوگو!) ہی آیا ہے۔

یٰاَیُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

"یٰاَیُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا" مدنی آیات ہی میں آیا ہے۔ مکی زندگی میں اکثر حضرات اسلام لے آئے تھے۔ لیکن چونکہ ان کی زندگی ہنوز انفرادی تھی اس لئے انہیں یٰاَیُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کہہ کر مخاطب نہیں کیا گیا۔ مدنی زندگی میں جب انہیں اقتدار حاصل ہو گیا اور انہوں نے اپنی مملکت قائم کر لی تو اس وقت "یٰاَیُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا" کے مخاطب

کے اہل قرار پاتے۔ اس سے واضح ہے کہ ارباب ایمان "یا یہا الذین آمنوا" کہہ کر پکارے جانے کے سزاوار اُس وقت ہوتے ہیں جب انہیں اقتدار حاصل ہو جائے اور وہ کتاب اللہ کی حکومت قائم کر سکیں۔ اسی کو اسلامی نظام کہا جاتا ہے۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، خدا پر ایمان کا عملی مفہوم کتاب اللہ کی حاکمیت ہے۔ یہی کفر اور ایمان میں حدِ امتیاز ہے۔ جیسا کہ اس نے کہا ہے۔ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ "جو کتاب اللہ کی حاکمیت قائم نہیں کرتے انہیں کافر کہا جاتا ہے"۔

سب سے پہلے اس قسم کی مملکت نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ میں مدینے میں قائم ہوئی اور اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے حضورؐ سے ارشاد فرمایا کہ:

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ - (۵/۴۸)

اے رسول! تم ان لوگوں کے معاملات کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کیا کرو۔

اور وحیِ خداوندی نے حضورؐ کی لسانِ مبارک سے یہ اعلان کرایا کہ:

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا... (۶/۱۱۵)

اے لوگو! (جو انسانوں کی حکومت کے خوگر ہو چکے ہو) کیا تم چاہتے ہو کہ میں بھی خدا کو چھوڑ کر انسانی حاکم تلاش کروں حالانکہ اس نے تمہاری طرف ایک ایسی کتاب نازل کر دی ہے جو اپنی ہر بات کو نکھار کر بیان کر دیتی ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ وہ جو (آیت ۳/۷۹ میں) کہا گیا تھا کہ کسی نبی کو بھی اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں پر اپنی حاکمیت قائم کرے، نبی اکرمؐ کی زبانِ مبارک سے اس طرح واضح الفاظ میں اس کا اعلان کرا دیا۔ بلکہ یہاں تک کہلا دیا کہ:

قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (۶/۱۵)

اے رسول! ان سے کہہ دو کہ اگر میں بھی خدا کے کسی حکم کی نافرمانبرداری کروں تو ... اس کے عذابِ الیم سے ڈرتا ہوں۔

غور فرمایئے کہ حضور نبی اکرمؐ کو مثال کے طور پر پیش کر کے انسانوں پر انسانی حکومت کے تصور کی کس طرح جڑ کاٹ کر رکھ دی۔!

(۲) یہاں تک یہ واضح ہو گیا کہ نظامِ خداوندی میں جسے الدّین کہا جاتا ہے، حکومت صرف کتاب اللہ کی ہو سکتی ہے۔ لیکن کتاب اللہ کی صورت یہ ہے کہ اس میں متعین احکام تھوڑے سے ہیں اور زندگی کے باقی معاملات کے متعلق صرف اصول اور اقدار دیئے گئے ہیں جنہیں "حدود اللہ" کہہ کر پکارا گیا ہے اور جماعتِ مومنین کا فریضہ ان حدود کا تحفظ قرار دیا گیا ہے

حُدُودُ اللّٰہ

(وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ - (۹/۱۱۲))۔ ان اصول و اقدار کو حدود کہنے میں ایک عظیم حقیقت پوشیدہ ہے۔ جس کتاب کو تمام زمانوں اور تمام اقوامِ عالم کے لئے ضابطۂ حیات اور آئینِ زندگی قرار پانا تھا، اسے ہونا ہی ایسا چاہیئے تھا کہ اس میں ابدی، مستقل، غیر متبدل حدود متعین کر دیئے جاتے۔ اور اس کتاب کی حاکمیت قائم کرنے والوں کو اس کی آزادی ہوتی کہ وہ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے جزئی قوانین اور وقتی

احکام خود متعین کریں۔ یہ جزئی قوانین حالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ بدلتے رہیں گے اور خدا کی مقرر کردہ حدود اپنی جگہ محکم اور غیر متبدل رہیں گی۔ اگر اس کتاب میں جزئی قوانین بھی خود ہی متعین کر دیئے جاتے تو یہ کتاب عالمگیر انسانیت اور زمانے کے بدلنے والے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکتی۔ جزئی قوانین ابدی اور غیر متغیر ہو نہیں سکتے۔

حدود اللہ کے علاوہ، قرآن مجید میں جو چند احکام آئے ہیں وہ بھی ابدی ہیں، لیکن ان کے متعلق قرآن کریم نے یہ حکمت ملحوظ رکھی ہے کہ جن حالات میں انہیں نافذ کیا جائے گا اور جس طریق سے ان پر عمل پیرا ہو جائے گا، انہیں قرآن نے خود متعین نہیں کیا۔ اپنے حالات کی روشنی میں طریق کار کا تعین ہر دور کی قرآنی مملکت خود کرے گی۔

(۸) یہاں سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان جزئی قوانین کا تعین کس طرح سے کیا جائے گا۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے خود ہی طے فرما دیا کہ یہ کچھ جماعتِ مومنین کے باہمی مشورہ سے کیا جائے گا۔ آپ غور فرمایئے کہ آج سے چودہ سو سال پہلے

نظامِ مشاورت

نظامِ مشاورت کا تصور ہی نہیں، اس کے قیام کا حکم دینا کیسی عظیم حکمتِ بالغہ ہے۔

ضمناً۔ آج کل عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ مغربی نظامِ جمہوریت کے دلدادہ اس نظام کی تائید میں قرآن کے نظامِ مشاورت کو بطور سند پیش کر دیتے ہیں۔ انہیں کون بتائے کہ قرآن کے نظامِ مشاورت اور مغرب کے جمہوری نظام میں کفر اور اسلام کا فرق ہے۔ قرآن کے نظامِ حکومت میں یہ مشاورت قرآن کی قائم کردہ غیر متبدل حدود کے اندر رہتے ہوئے ہی عمل میں آسکتی ہے۔ لیکن مغربی نظامِ جمہوریت میں قانون سازی کے اختیارات پر کسی قسم کی حدود اور قیود عائد نہیں ہوتے۔ اس میں اکثریت کا فیصلہ حق قرار پاجاتا ہے۔ یہاں ایک بڑا بصیرت افروز نکتہ سامنے آتا ہے۔ سورۃ انعام کی دو آیات پہلے درج کی جا چکی ہیں۔ یعنی آیت (۶/۱۱۵) جس میں یہ کہا گیا کہ خدا کے سوا کوئی حاکم تسلیم نہیں کیا جا سکتا اور اس نے اپنی حاکمیت کے لئے مفصل کتاب نازل کر دی ہے۔ اس کے ساتھ آیت (۶/۱۱۶) میں کہا گیا کہ یہ کتاب مکمل بھی ہے اور غیر متبدل بھی۔ ازاں بعد خدائے سمیع و علیم نے فرمایا:۔

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۔ (۶/۱۱۷)

اگر تو اکثریت کا اتباع کرنے لگ جائے تو وہ تجھے خدا کے راستے سے گمراہ کر دیگی۔ جو لوگ (وحی کی قیود کو اپنے اوپر عائد نہیں کرتے) وہ حق و صداقت کی نہیں بلکہ ظن و قیاس کی پیروی کرتے ہیں۔

آپ دیکھیے کہ خدائے سمیع و علیم نے کس طرح چودہ سو سال پہلے موجودہ دور کے نظامِ جمہوریت کو باطل اور گمراہ کن قرار دے دیا۔ بلا حدود و قیود قانون سازی کا اختیار صرف خدا کو حاصل ہے۔ انسانوں کو اس قسم کے اختیارات کا حامل تسلیم کر لینا انہیں مقامِ الوہیت عطا کر دینا ہے جو شرکِ عظیم ہے۔ قرآن حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے مشاورت کا حکم دیتا ہے۔

(۹) جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ پہلی قرآنی مملکت رسول اللہ نے قائم فرمائی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو حکم دیا گیا کہ:۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (۳/۱۵۹)

مملکت کے معاملات میں اپنے رفقاء سے مشورہ کیا کرو۔

یہ ظاہر ہے کہ جو معاملہ باہمی مشورہ سے طے کیا جائے گا وہ احکامِ خداوندی کی طرح غیر متبدل نہیں ہو سکتا۔ اول تو وہی مجلسِ مشاورت

جس نے ایک فیصلہ کیا تھا، مزید غور و فکر کے بعد یا حالات کی تبدیلی کے تقاضے کے تحت خود اپنے فیصلہ میں تبدیلی کر سکے گی یا بعد میں آنے والی مجلسِ مشاورت ایسا کرنے کی مجاز ہوگی۔ اس طرح حدود اللہ تو اپنے مقام پر محکم، اٹل اور غیر متبدل رہیں گی اور ان کے اندر رہتے ہوتے جو کچھ باہمی مشاورت سے طے پائے گا وہ قابلِ تغیر و تبدل ہوگا۔ یہ نظام نبی اکرمؐ اور حضورؐ کے سچے جانشینوںؓ کے زمانے میں قائم رہا اور مشاورت سے طے پاتے ہوتے امور میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ قرآن کے اسی نظام کا نام استخلاف فی الارض یا اسلامی مملکت ہے۔ قرآن کا منشا یہ تھا کہ امتِ مسلمہ میں یہ نظام اسی طرح مسلسل قائم رہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں متنبہ کر دیا تھا کہ دیکھنا کہیں اس رسول کی وفات کے بعد پھر سے اس نظام کہن کی طرف نہ پلٹ جانا جس میں خدا کے بجائے انسانوں کی حکومت قائم ہوتی تھی۔ (۳/۱۴۴)

اسلامی مملکت کے عناصر

آگے بڑھنے سے پیشتر اس نظام یا مملکت کے بنیادی عناصرِ ترکیبی ایک بار پھر سامنے لے آئیے۔ یعنی :-

(۱) ان لوگوں پر مشتمل ایک امت جن کا ایمان یہ تھا کہ حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے اور اس کی یہ حکومت اس کی کتاب کی رُو سے قائم ہوتی ہے۔

(۲) اس کتاب میں نازل کردہ احکام و اصول و اقدار جنہیں حدود اللہ کہا جاتا ہے، ابدی اور غیر متبدل ہیں اور ان کی روشنی میں جزئی احکام و قوانین امت کے باہمی مشورے سے طے ہوں گے۔

(۳) جو کچھ اس طرح طے پائے گا وہ اس حکومت کی مرکزی اتھارٹی کی طرف سے نافذ ہوگا۔ ان احکام کو احکامِ شریعت سے تعبیر کیا جائے گا۔ اس حکومت کے سوا کسی کو نہ کسی قسم کے احکام وضع کرنے کا حق حاصل ہوگا نہ نافذ کرنے کا اختیار۔

(۴) یہ احکام تمام افرادِ امت پر یکساں نافذ ہوں گے اور انسانی زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہوں گے۔

ان تصریحات سے یہ بات واضح ہے کہ قرآن کی رُو سے اس امت میں نہ الگ الگ فرقے ہوں گے نہ ان فرقوں کے ایک دوسرے سے الگ قوانین۔ نہ ہی ان قوانین میں پرسنل لاز (شخصی قوانین) اور پبلک لاز (ملکی قوانین) کی تفریق و تخصیص ہوگی۔ نہ ان میں مختلف فقہیں کا وجود ہوگا نہ ان کی مرتب کردہ الگ الگ فقہیں۔ ایک امت، ایک ضابطۂ ہدایت، ایک مملکت اور اس کی طرف سے نافذ کردہ ایک ضابطۂ قوانین۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے صدرِ اول کی کوئی مستند اور مصدقہ، بلکہ قابلِ اعتماد تاریخ ہمارے پاس نہیں۔ اس دور کی سب سے پہلی جامع تاریخ تیسری صدی ہجری میں مرتب ہوئی جسے طبرستان کے ایک مؤرخ (امام طبری) نے کسی تحریری مواد کے بغیر زبانی روایات سے جمع اور مدون کیا۔ بنا بریں تاریخی طور پر تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ نظامِ مملکت کتنے عرصے تک قائم رہا لیکن ایک بات یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے۔ اور وہ یہ کہ حضور نبی اکرمؐ اور آپؐ کے رفقائے کرامؓ (جنہیں صحابہؓ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے) کے دورِ حکومت تک یہ نظام قائم تھا کیونکہ اس امر کی شہادت قرآن میں موجود ہے کہ وہ مومنِ حقہ تھے اور مومن حقہ انہی کو کہا جاتا ہے جو کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم کریں۔ اس کے بعد بنو امیہ کے زمانے میں بھی دو باتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک یہ کہ ان کے عہد میں امت میں کوئی فرقہ پیدا نہیں ہوا تھا ——— اور دوسری بات یہ کہ اس زمانے میں قرآن مجید کے سوا قانون (فقہ) کی کوئی کتاب نظر نہیں آتی۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ اس زمانے تک امت، امتِ واحدہ تھی۔ نہ اس میں مذہبی فرقے وجود میں آئے تھے نہ ان کی الگ فقہیں مرتب ہوئی تھیں۔ یہ کچھ ان کے بعد عباسیوں کے زمانے میں ظہور میں آیا۔ (واضح رہے کہ جو کچھ ہم نے بنی امیہ کے زمانے

کے متعلق لکھا ہے وہ ہمارا تاریخی اندازہ ہے جس کی صحت پر ہم اصرار نہیں کر سکتے۔ نہ ہی اسے ہمارے پیشِ نظر موضوع سے خاص تعلق ہے۔ ہم کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ قرآنی نظامِ مملکت کچھ عرصے تک قائم رہا اور اس کے بعد اس میں تبدیلی آگئی۔

(۰)

(۱۰) پہلے کہا جا چکا ہے کہ دین کا تمکن قرآنی نظامِ مملکت کے ساتھ مشروط اور وابستہ ہے۔ یہ نظام نہ رہے تو معاشرہ میں دین کا وجود ہی نہیں رہتا۔ جب قرآنی نظامِ حکومت کی جگہ ملوکیت آگئی (واضح رہے کہ ہر وہ حکومت جو امت کے مشورے کے بجائے قوت کے بل بوتے پر ... ملوکیت کہلائیگی۔ اور جب یہ موروثی طور پر آگے چلے تو یہ ملوکیت کی بدترین شکل ہوگی) جب مسلمانوں میں اس قسم کی حکومت قائم ہوگئی تو دین باقی نہ رہا ... اس کے بعد تاریخ کے اس پورے دور میں (یعنی اس زمانے سے لیکر آج تک) مسلمانوں کی حکومتیں تو قائم ہوتی رہیں لیکن اسلامی حکومت کہیں بھی قائم نہ ہوتی۔ ملوکیت نے سب سے پہلے ثنویت کی طرح ڈالی یعنی امورِ مملکت (جنہیں موجودہ دور کی اصطلاح میں پبلک لاز کہا جاتا ہے) حکومت نے اپنے ہاتھ میں رکھے اور شخصی قوانین ارباب مذہب کی تحویل میں دے دیئے۔ مسلمان بادشاہ، امورِ مملکت کے متعلق جو فیصلے کرتے انہیں وہ اسلام کا نام دے دیا

موروثی بادشاہتیں

کرتے تاکہ عوام مطمئن رہیں کہ اسلامی حکومت قائم ہے۔ اس تاثر کو ہمارے علماء کرام کی تائید اور بھی تقویت پہنچاتی تھی۔ وہ ان موروثی بادشاہوں کے حق میں محراب و منبر سے اَیَّدَ اللّٰہُ بِنَصْرِہٖ اور خَلَّدَ اللّٰہُ مُلْکَہٗ کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ انہیں ظِلُّ اللّٰہِ عَلَی الْاَرْضِ ۔ "زمین پر خدا کا سایہ" کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ ملوکیت کے اس ماحول میں امورِ مملکت کے متعلق جس قسم کے فتاویٰ صادر ہوا کرتے تھے اس کا اندازہ اس ایک فتوےٰ سے لگا لیجئے جو فقہ حنفی کی مستند کتاب (ہدایہ اولین مجیدی۔ ص۴۹۳) میں ان الفاظ میں درج ہے۔

کل شیٔ صنعہ الامام الذی لیس فوقہ امام فلاحد علیہ الا قصاص۔

یعنی جن جرائم کی سزا حد ہے سربراہِ مملکت سے ان میں سے کسی کا مواخذہ نہیں کیا جا سکتا بجز قصاص کے۔ یعنی سربراہِ مملکت پر قصاص کے سوا کسی جرم پہ حد نہیں لگ سکتی۔ جہاں تک شخصی قوانین کا تعلق ہے چونکہ ان کی تدوین و تنفیذ کے لئے کوئی مرکزی اتھارٹی نہیں تھی، اس لئے مختلف فقہا نے اپنے اپنے طور پر قوانین مرتب کر لئے۔ اور ان کے معتقدین نے ان قوانین کا اتباع اپنے اوپر لازم قرار دے لیا۔ اس طرح یہ امتِ واحدہ فرقوں میں بٹ گئی۔ ان ائمہ فقہا کی تعداد تو بہت زیادہ تھی لیکن ان میں سے چار نے بڑی شہرت حاصل کی۔ یعنی:-

ائمہ فقہاء

(۱) امام اعظمؒ (کوفی) پیدائش سنہ ۸۰ھ ، وفات سنہ ۱۵۰ھ

(۲) امام مالکؒ (یمنی، مدنی) پیدائش سنہ ۹۳ھ وفات سنہ ۱۷۹ھ

(۳) امام شافعیؒ (عسقلانی۔ مکی) پیدائش سنہ ۱۵۰ھ وفات سنہ ۲۰۴ھ

(۴) امام احمد بن حنبلؒ (بغدادی) پیدائش سنہ ۱۶۴ھ وفات سنہ ۲۴۱ھ

(اہلِ تشیع کی فقہ جعفری ان سے الگ ہے)

شروع شروع میں تو ان ائمہ فقہا کے متبعین اپنے اجتہاد سے ایسے مسائل بھی وضع کرتے تھے جو ان کے پیشروؤں کے خلاف ہوں۔ نیز ان کے مرتب کردہ مسائل کی فہرست میں حک و اضافہ بھی کرتے رہتے تھے لیکن رفتہ رفتہ یہ سلسلہ ختم ہو گیا اور عقیدہ یہ پیدا ہو گیا کہ کسی شخص کے لئے جائز نہیں کہ کسی مسئلہ میں ایسی بات کہے جو اس قول کے ... جس کا

فتوٰی اس کے امام نے دیا ہے۔ چنانچہ فقہائے حنفیہ کے پیشوا اور مسلّم امام، ابوالحسن عبید اللہ الکرخیؒ نے یہاں تک کہہ دیا کہ:

> ہر وہ آیت جو اس طریقہ کے مخالف ہو جس پر ہمارے اصحاب ہیں وہ یا تو متأوّل ہے یا منسوخ۔ اور اسی طرح جو حدیث اس قسم کی ہو وہ متأوّل یا منسوخ ہے۔[1]

اجتہاد کا دروازہ بند کر دینے کے بعد اُس وقت تک کے دیئے گئے فتاوٰی کو کتابی شکل میں مرتب کر دیا گیا۔ ان مجموعوں کا نام فقۂ حنفی ہے۔ واضح رہے کہ یہ فقہ، امام ابوحنیفہؒ کی مرتب کردہ نہیں۔ یہ حنفی مسلک کے مختلف فقہا کے فتاوٰی کا مجموعہ ہے۔ انہی فتاوٰی کا ایک جامع مجموعہ شہنشاہ عالمگیرؒ کے زمانے میں مرتب کیا گیا جو فتاوٰی عالمگیری کے نام سے مشہور ہے۔

مذہب کی حیثیت سے (یعنی دینی حیثیت سے نہیں بلکہ مذہبی حیثیت سے) ان فقہی احکام کی ایک اہمیت ضرور تھی اور وہ یہ کہ کم از کم ایک فقہ کے مقلدین ایک مسلک سے منسلک رہتے تھے۔ لیکن اسے دینی حیثیت تو کسی صورت میں بھی نہیں دی جا سکتی۔ دین کا تمکّن تو اسی دن ختم ہو گیا تھا جب قرآنی نظامِ مملکت باقی نہ رہا تھا۔

دینی نقطۂ نگاہ سے اس میں ایک اور بنیادی خرابی تھی اور وہ یہ کہ انسانوں کے وضع کردہ ان قوانین کو درجۂ الوہیت[2] دے دیا گیا۔ یہ نکتہ غور سے سمجھنے کے قابل ہے۔ قوانینِ خداوندی کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ابدی اور غیر متبدل ہیں۔ یہ حیثیت انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو دے دی جائے تو یہ انہیں خدائی حیثیت دے دینے کے مرادف ہوگا۔ قرآنِ کریم نے سابقہ اہلِ کتاب کے خلاف جو یہ اعتراض کیا ہے کہ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ ($\frac{9}{31}$)۔ کہ وہ اپنے مذہبی پیشواؤں کو خدائی درجہ دے دیتے تھے تو اس سے یہی مراد ہے کہ وہ ان کے وضع کردہ قوانین کو خدائی قوانین جیسا درجہ دے دیتے تھے اور یہ کھلا ہوا شرک تھا۔ قرآنِ کریم نے امت میں فرقوں کے وجود کو شرک قرار دیا ہے تو اس کی بھی یہی وجہ ہے ($\frac{30}{32}$)۔ فرقے کا وجود اس عقیدہ پر قائم ہوتا ہے کہ اس کے متبعین اپنے فرقے کے بانیوں کے وضع کردہ عقائد و احکام کو منفرد، ابدی اور غیر متبدل سمجھتے ہیں۔ کوئی دس سال اُدھر کی بات ہے کہ ہمارے ہاں یہ خیال ابھرا کہ مروجہ اسلامی احکام کے متعلق کچھ تحقیقاتی کام کیا جائے۔ اس تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے جامعہ اشرفیہ (لاہور) کے مفتی جمیل احمد تھانوی نے ارشاد فرمایا کہ:

> یہ طے شدہ بات ہے کہ تحقیق و تفتیش کا کام پہلی صدی، دوسری صدی اور تیسری صدی میں پایۂ تکمیل تک پہنچ چکا ہے۔ اسی کا نام فقہ اسلامی ہے جو ائمۂ ھدٰی کی تحقیقات کا مجموعہ ہے...... لہٰذا اگر تحقیقاتِ اسلامی سے ایسے ایسے مفہومات مراد ہوں جو مکمل اور تنقیح شدہ موجود ہیں تو موجودہ دور کی تحقیق اگر اس کے مطابق ہے تو بلا ضرورت ہے اور اگر وہ تحقیق اس کے خلاف ہے تو مردود ہے۔ اس پر امتِ محمدیہ کا

---

[1] تاریخ التشریع الاسلامی۔ مؤلفہ علامہ محمد الخضری کا اردو ترجمہ۔ "تاریخ فقہ اسلامی"
شائع کردہ: دار المصنفین، اعظم گڑھ۔ صفحہ ۳۲۱

[2] ائمہ فقہ کی تفقہی قابلیت مسلّم۔ ان کا تقوٰی اور دیانت بھی شک و شبہ سے بالا سہی لیکن اس کے باوجود وہ تھے تو انسان ہی۔ انہیں مقام انسانیت سے بلند تصور کر کے الوہیت کے درجہ پر سرفراز کر دینا شرک ہے۔

اجماع ہے۔ (بحوالہ۔ ایشیا۔ ۴ر اگست ۱۹۶۸ء)
یہ ہے فقہی قوانین کے متعلق وہ عقیدہ جو مسلسل چلا آرہا ہے۔

(۰)

اقبالؒ کی نگہ بصیرت

(۱) یہ صورت صدیوں سے مسلسل چلی آرہی تھی کہ فطرت کی کرم گستری سے ہمارے ہاں ایک ایسا دیدہ ور پیدا ہوا جو اقبالؒ کے نام سے معروف ہے۔ اس کی نگہ بصیرت نے جب "عالمِ اسلام" (یعنی مسلمانوں کے ممالک) پر غور کیا تو اس نے دیکھا ان میں کسی جگہ بھی نہ اسلامی حکومت قائم ہے نہ اسلام اپنی صحیح شکل میں کارفرما۔ یہاں خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے رکھی ہے اور دین کی جگہ مذہب نے۔ اس نے اس کے خلاف جہاد کا عزم کیا اور ساری عمر اس پر قائم رہا۔ اس نے دیکھا کہ ان تمام خرابیوں کی جڑ یہ ہے کہ خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے رکھی ہے۔ (خلافت سے مراد ہے قرآنی نظامِ حکومت جو صدرِ اول میں قائم ہوا تھا) چنانچہ اس نے سب سے پہلے اس کے خلاف نعرہ بلند کیا اور کہا کہ:

خلافت برمقامِ ما گواہی است — حرام است آنچہ بر ما پادشاہی است
ملوکیت ہمہ مکر است و نیرنگ — خلافت حفظِ ناموسِ الٰہی است

(ارمغانِ حجاز۔ ص۱۲۶)

اگلے صفحے پر لکھتے ہیں:۔

ہنوز اندر جہاں آدم غلام است — نظامش خام و کارش ناتمام است
غلامِ فقرِ آں گیتی پناہم — کہ در دینش ملوکیت حرام است

یہ بہت بڑا انقلابی نعرہ تھا اور عرب و عجم کے خلاف اعلانِ جنگ۔ اسے اس کا پورا پورا احساس تھا کہ اس اعلان کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اسی بنا پر اس نے کہا تھا کہ:

درافتد با ملوکیت کلیمے — فقیرے، بے کلاہے، بے گلیمے
گہے باشد کہ بازیہائے تقدیر — بگیرد کارِ صد صر از نسیمے (ص۱۲۷)

اسے معلوم تھا کہ اس انقلابی نعرہ کی مخالفت میں مذہبی پیشوائیت سب سے پہلے میدانِ کارزار میں سامنے آئے گی۔ اقبالؒ کے کلام میں مُلّا کے خلاف جو کچھ کہا گیا ہے وہ کسی خاص شخصیت یا گروہ کے خلاف نہیں۔ وہ مذہبی پیشوائیت کے مسلک اور وجود کے خلاف ہے جو صدیوں سے مسلمانوں کے غیر اسلامی نظام کو اسلامی کہہ کر پیش کر رہا تھا۔ ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کی مخالفت، اس جنگ کا منفی پہلو تھا۔ اس کے مثبت پہلو کے سلسلہ میں اقبالؒ جانتا تھا کہ اسلامی نظام کا صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک اسے عملی شکل میں سامنے نہ لایا جائے۔ اور ایسا کیا جانا ایک ایسی آزاد مملکت ہی میں ممکن ہے جس میں پہلے سے کوئی نظام قائم نہ ہو۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے مملکتِ پاکستان کا تصور دیا۔ انہیں معلوم تھا کہ اس مملکت میں پہلا سوال یہ سامنے آئے گا کہ اس میں اسلامی قوانین کس اصول کے مطابق مدوّن کئے جائیں۔ اس سوال کے ضمن میں انہوں نے بڑی تفصیل سے گفتگو کی اور علاوہ دیگر مقامات، انہوں نے اپنے مشہور خطبات میں ایک پورا خطبہ اسی موضوع کے لئے وقف کر دیا۔ ہم اس خطبہ کے چیدہ چیدہ اقتباسات پیشِ قارئین کرتے ہیں۔

خطبۂ اقبال کے اقتباسات

"اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلی کی روحانی اساس، ازلی اور ابدی ہے۔ لیکن اس کی نمود تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو، اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر (جیسے متضاد عناصر) میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیر کا دور دورہ ہے، ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرہ میں تغیر کا امکان ہی نہیں ـــــ وہ تغیر جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے ـــــ تو اس سے زندگی جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے، یکسر جامد و متصلب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی اور سیاسی علوم میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس، گزشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ لہٰذا، دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اسلام کی وضع اور ترکیب میں کون سا اصولِ حرکت کارفرما ہے؟ یہ وہی اصول ہے جسے اجتہاد کہتے ہیں۔"

اس کے بعد وہ اس خطبہ میں مسئلہ اجتہاد پر بڑی تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں۔ وہ اجتہادِ مطلق کو اسلام کا بنیادی اصول قرار دیتے ہیں۔ یعنی قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے قانون سازی کا کلی اختیار۔ وہ اس اجتہاد کے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"سُنّی حضرات، نظری طور پر تو اس کے قائل ہیں کہ اس قسم کا اجتہاد ممکن ہے لیکن ائمہ فقہ کے مذاہب کے قیام کے بعد عملاً اس کا دروازہ بند ہے۔ اس لئے کہ اس قسم کے اجتہاد کے لئے جن شرائط کو ضروری قرار دیا جاتا ہے، ان کا پورا کرنا کسی ایک فرد کے لئے قریب قریب ناممکن ہے۔ ایک ایسے نظامِ شریعت میں، جس کی بنیاد قرآن پر ہو جو زندگی کے متعلق حرکیاتی اور ارتقائی تصور کا علمبردار ہے، اس قسم کی ذہنیت کچھ عجیب سی دکھائی دیتی ہے۔ لہٰذا، آگے بڑھنے سے پیشتر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان اسباب و علل کا انکشاف کریں جن کی وجہ سے یہ ذہنیت پیدا ہوئی جس نے قوانینِ شریعت کو یکسر منجمد بنا کر رکھ دیا۔"

ہم اس وقت ان اسباب و علل کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے جنہیں علامہ اقبالؒ نے اس جمود و تعطل کا ذمہ دار گردانا ہے۔ ان میں سے دو ایک اہم نکات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ وہ (اپنے اسی خطبہ میں) لکھتے ہیں:۔

"آیئے اب ایک نظر ان اصولوں پر ڈالیں جو قرآن نے قانون سازی کے سلسلہ میں دیئے ہیں۔ ان پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان اصولوں کی رُو سے یہ قطعاً نہیں ہوتا کہ انسانی فکر سلب ہو جائے اور قانون سازی کے لئے کوئی میدان ہی نہ رہے۔ اس کے برعکس، ان اصولوں میں جس قدر وسعت رکھی گئی ہے اس سے انسانی فکر بیدار ہوتی ہے۔ یہی وہ اصول تھے جن کی راہنمائی سے ہمارے قدیم فقہا نے قانونِ شرعی کے متعدد نظام (سسٹم) مرتب کئے۔ اور تاریخ اسلام کا طالب علم اس حقیقت سے واقف ہے کہ سیاسی اور معاشرتی نظامِ زندگی کی حیثیت سے اسلام کو جو اس قدر

کامیابی حاصل ہوتی تو اس کا کم از کم آدھا حصہ انہی فقہا کی بالغ نظری کا رہینِ منت تھا چنانچہ فان کریمر اس ضمن میں لکھتا ہے کہ:

رومیوں کو چھوڑ کر دنیا میں سوائے عربوں کے اور کوئی قوم ایسی نہیں جس کے پاس اس قدر احتیاط سے مرتب کردہ قانونی نظام ہو۔

لیکن اس تمام ہمہ گیری کے باوجود، یہ قانونی ضوابط بالآخر انفرادی تعبیرات کا مجموعہ ہیں۔ اس لئے انہیں حتمی اور قطعی سمجھ لینا غلط ہے۔ مجھے اس کا علم ہے کہ علمائے اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہمارے مشہور مذاہب (اربعہ) اپنی اپنی جگہ مکمل اور مختتم ہیں۔ لیکن نظری طور پر اجتہادِ مطلق کے امکان سے انہیں بھی کبھی انکار نہیں ہوا۔ میں نے (پچھلے صفحات میں) ان اسباب و علل سے بحث کی ہے جو علماء کی اس ذہنیت کا موجب بنے۔ لیکن چونکہ اب حالات بدل چکے ہیں، اور دنیائے اسلام ان تمام نئی نئی قوتوں سے دوچار اور متاثر ہے جو زندگی کے مختلف گوشوں میں فکرِ انسانی کی نشوونما سے وجود میں آگئی ہیں، اس لئے مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس قدامت پرستانہ ذہنیت کو باقی رکھا جائے۔ یہ پوچھتا ہوں کہ کیا ان مذاہبِ فقہ کے بانیوں میں سے کسی نے کبھی اپنی تعبیرات و تاویلات کو کبھی قطعی، اکمل، مختتم اور سہو و خطا سے مبرّا سمجھا؟ کبھی نہیں! اس لئے اگر دورِ حاضر کے اعتدال پسند مسلمان، زمانے کے بدلے ہوئے حالات اور اپنے تجربہ کی روشنی میں، فقہ کے اصولِ اساسی کی نئی تعبیرات کرنا چاہتے ہیں تو ان کا یہ طرزِ عمل میرے خیال میں بالکل بجا اور درست ہے۔ خود قرآن کی یہ تعلیم کہ حیات ایک ترقی پذیر عملِ ارتقا ہے، اس کی مقتضی ہے کہ ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں سلف کے علمی سرمایہ سے راہ نمائی لے سکتے ہیں لیکن اسلاف کے فیصلے ان کے راستے میں روک نہیں بن سکتے۔"

وہ اس قسم کی ماضی پرستی کو تاریخ کا جھوٹا احترام قرار دیتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ کہتے ہیں کہ:

"قوموں کے زوال کا علاج ان کے ماضی کی تاریخ کے جھوٹے احترام اور اس کے مصنوعی احیاء سے نہیں ہو سکتا، جیسا کہ دورِ حاضر کے ایک مصنف نے لکھا ہے کہ:

تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ خیالات اور نظریات جو اپنی توانائی کھو کر فرسودہ ہو چکے ہوں، ان لوگوں میں کبھی پھر سے توانائی حاصل نہیں کر سکتے جنہوں نے انہیں فرسودہ بنا دیا ہو۔

تیرہویں صدی اور اس کے بعد کے علماء کا یہ رجحان کہ ماضی کی جھوٹی تقدیس سے جماعتی نظم کو جامد اور متصلب طور پر قائم رکھا جائے، اسلام کی روح کے یکسر خلاف تھا۔"

اور اس نکتہ کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

"اسلام میں اجتہاد کا دروازہ بند کر دینا، اسلام کے خلاف افترا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہوئی کہ مسلمانوں میں قانون کے تصور نے ایک خاص معین شکل اختیار کر لی اور ایک وجہ یہ کہ قوموں کے زوال کے زمانہ میں ذہنوں میں اس قدر جمود اور تساہل پیدا ہو جاتا ہے کہ بڑے بڑے مفکرین کو (انسان سمجھنے کے بجائے) معبود بنا دیا جاتا ہے۔ اگر علمائے متاخرین میں سے بھی بعض نے اس "افتراء" کو برقرار رکھا ہے تو وہ ان کا اپنا فعل ہے۔ دورِ حاضر کا مسلمان اس کا پابند نہیں کہ جس طرح انہوں نے برضا و رغبت اپنی فکری آزادی کو (اپنے خود ساختہ معبودوں کی) نذر کر دیا تھا۔ یہ بھی اپنی آزادی کو سلب ہو جانے دیں۔

علامہ سرخسیؒ (دسویں صدی میں) لکھتے ہیں :-

اگر اس افتراء کے حامی یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے زمانے کے مفکرین و مصنفین کو زیادہ سہولتیں حاصل تھیں، اور ان کے مقابلہ میں متاخرین کے راستے میں بہت سی دشواریاں ہیں، تو ایسا سمجھنا سراسر حماقت ہے۔ اس لئے کہ اس معمولی سی بات کے سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کی عقل کی ضرورت نہیں کہ متقدمین کے مقابلہ میں متاخرین کے لئے اجتہاد زیادہ آسان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب قرآن اور سنت کی اس قدر تفسیریں اور شرحیں لکھی جا چکی ہیں کہ ہمارے زمانے کے مجتہد کے پاس، تعبیرات کے لئے کافی سے زیادہ مسالہ موجود ہے (جو متقدمین کے پاس نہیں تھا)۔

اربابِ علم سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ یہ نظریہ کہ کسی ایک دور کے قوانین ہمیشہ کے لئے غیر متبدل ہوتے ہیں، سب سے پہلے امام شافعیؒ نے پیش کیا تھا اور یہ سن کر آپ کو شاید حیرت ہو کہ اس کی مخالفت خود حنفی کرنے لگے تھے۔ علامہ اقبالؒ نے ان کی اس بحث پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا :-

"امام شافعیؒ نے اپنے آپ کو صرف ان نظائر کے دائرہ میں محدود کر لیا جو عہدِ رسالت مآبؐ اور عہدِ صحابہؓ میں وقوع میں آئے تھے۔ اس سے ان کی نگاہ کا دائرہ بہت تنگ ہو کر رہ گیا۔ انہوں نے بات تو یہاں سے شروع کی تھی کہ اہمیت ٹھوس واقعات کو حاصل ہے۔ لیکن انہوں نے (ایک خاص دور کے) ٹھوس واقعات کو ابدی اور غیر متبدل سمجھ لیا، اور خاص واقعات سے متعلق احکام کو اس قسم کے ملتے جلتے واقعات پر منطبق کرنے کے لئے قیاس سے شاذ و نادر کام لیا۔ ان کے برعکس، ان کی سخت تنقیدیں مذہبِ حنفی کے لئے (ایک اور رنگ میں) بڑی مفید ثابت ہوئیں۔ اس سے انہوں نے محسوس کر لیا کہ اصولِ قانون سازی کی تعبیر میں، زندگی کی حقیقی (واقعاتی) نقل و حرکت اور تنوع کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کا مکتبِ فقہ جس نے ان مباحث کے نتائج کو اچھی طرح جذب کر لیا تھا، اپنے خاص الخاص اصولِ فقہ میں بالکل آزاد ہے اور دیگر مذاہبِ فقہ اور تشریع کے مقابلہ میں، حالات سے مطابقت کی بڑی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے۔"

اور اس کے بعد وہ کہتے ہیں :-

"لیکن جائے حیرت ہے کہ موجودہ حنفی علماء نے خود اپنے مکتبِ فقہ کی روح کے خلاف، امام ابوحنیفہؒ اور ان کے رفقاء کے فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے رکھا ہے، بعینہٖ اسی طرح جس طرح امام ابوحنیفہؒ پر تنقید کرنے والوں نے اُن فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے لیا تھا جو عہدِ رسالتمآبؐ اور صحابہؓ میں پیش آمدہ معاملات کے سلسلہ میں نافذ ہوئے تھے۔"

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے، علامہ اقبال کو اس کا احساس تھا کہ مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ان کے اس نظریے کی شدت سے مخالفت ہوگی چنانچہ انہوں نے لکھا :-

"مجھے اس میں ذرا سا بھی شبہ نہیں کہ اگر اسلامی قانون سے متعلق ضخیم لٹریچر کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو اس سے دورِ حاضر کے ناقدین کے اس سطحی خیال کی تردید ہو جائے گی کہ اسلامی قانون جامد اور ناقابلِ ترقی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں کا قدامت پرست طبقہ ابھی اس کے لئے تیار نہیں کہ قانون سازی کے مسئلہ کے متعلق تنقیدی نقطۂ نگاہ سے گفتگو کی جائے۔ اگر کسی نے اس بات کو اٹھایا تو یہ اقدام بہت سے لوگوں کے لئے وجہِ ناراضگی ہو جائے گا اور مخالفت کا دروازہ کھول

دے گا۔ بایں ہمہ، میں اس باب میں کچھ عرض کرنے کی جرأت کروں گا۔"

اس سے بھی بہت پہلے انہوں نے (صوفی غلام مصطفےٰ تبسم (مرحوم) کے نام) اپنے ایک خط میں لکھا تھا:۔

"ضرورت اس امر کی ہے کہ قرآن کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیادتِ انسانی کے لئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں اور اس میں فلاں فلاں آیات سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے۔ نیز جو جو قواعد عبادات یا معاملات کے متعلق (بالخصوص موخر الذکر کے متعلق) دیگر اقوام میں اس وقت تک مروج ہیں، ان پر قرآنی نقطۂ نگاہ سے تنقید کی جائے اور دکھایا جائے کہ وہ بالکل ناقص ہیں اور ان پر عمل کرنے سے نوعِ انسانی کبھی سیادت سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتی۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانۂ حال کے "جورس پروڈنس" یعنی اصولِ فقہ پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور بنی نوعِ انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا۔ قریباً تمام ممالک میں اس وقت مسلمان یا تو اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں، یا قوانینِ اسلامیہ پر غور و فکر کر رہے ہیں (سوائے ایران و افغانستان کے)، مگر ان ممالک میں بھی امروز و فردا یہ سوال پیدا ہونے والا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ زمانۂ حال کے اسلامی فقہاء یا تو زمانہ کے میلانِ طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔ ایران میں مجتہدینِ شیعہ کی تنگ نظری اور قدامت پرستی نے بہاء اللہ کو پیدا کیا جو سرے سے احکامِ قرآنی کا ہی منکر ہے۔ ہندوستان میں عام حنفی اس بات کے قائل ہیں کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں۔ میں نے ایک بڑے عالم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کا نظیر ناممکن ہے۔ غرضیکہ یہ وقت عملی کام کا ہے کیونکہ میری ناقص رائے میں مذہبِ اسلام گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخِ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔"

علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ "جائے حیرت ہے کہ موجودہ حنفی علماء نے خود اپنے مکتبِ فقہ کی روح کے خلاف امام ابوحنیفہؒ اور ان کے رفقاء کے فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے رکھا ہے۔" تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ امام اعظمؒ اپنے فتاویٰ کو کبھی ابدی اور غیر متبدل قرار نہیں دیتے تھے۔ خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے:۔

نصر بن محمد کہتے ہیں کہ ہم امام ابوحنیفہؒ کے پاس آیا کرتے تھے اور ہمارے ساتھ ایک شام کا آدمی بھی ہوتا تھا۔ جب وہ شامی (فراغت کے بعد) وطن کو واپس جانے لگا تو امام ابوحنیفہؒ سے رخصت ہونے کے لئے آیا۔ امام ابوحنیفہؒ نے اس سے پوچھا۔ "اے شامی! کیا تم اس کلام (فقہ) کو بھی اپنے ساتھ شام کی طرف لے جاؤ گے؟" شامی نے جواب دیا۔ "ہاں۔" اس پر امامؒ نے فرمایا۔ "خیال رکھنا۔ تم بڑے شر کو اپنے ساتھ لے جا رہے ہو۔" (خطیب ج ۱۳ صلـ۳۵۳)۔ مزاحم بن زفر کہتے ہیں کہ میں نے خود امام ابوحنیفہؒ سے سوال کیا کہ جو کچھ آپ فتویٰ دیتے ہیں یا اپنی کتابوں میں درج فرماتے ہیں کیا یہ سب حق ہے جس میں شک شبہ کی گنجائش نہیں؟ امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا۔ بخدا مجھے معلوم نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ باطل ہو اور اس کے باطل ہونے میں کسی شک شبہ کی گنجائش نہ ہو۔ امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ ہم امام ابوحنیفہؒ کے پاس آیا جایا کرتے تھے۔ جو کچھ امام ابوحنیفہؒ فیصلے فرماتے، ہم ان کو لکھ لیا کرتے تھے۔ امام زفرؒ کہتے ہیں کہ ایک دن امام ابوحنیفہؒ نے ابو یوسفؒ سے فرمایا۔ یعقوب! تیرا ناس ہو، جو کچھ تو مجھ سے سنتا ہے اسے سب کا سب نہ لکھ لیا کر۔ آج میری کچھ رائے ہوتی ہے اور کل میں اسے چھوڑ دیتا ہوں۔ ابو نعیمؒ کہتے ہیں کہ میں نے امام ابوحنیفہؒ کو ابو یوسفؒ سے یہ فرماتے ہوئے سنا کہ مجھ سے کوئی مسئلہ نقل نہ کرو کیونکہ بخدا

مجھے خبر نہیں کہ میں (اپنے اجتہاد میں) خطا کار ہوں یا مصیب (ایضاً) سہل بن مزاحم کہتے ہیں کہ میں اکثر امام ابوحنیفہؒ کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنتا تھا فبشر عبادی الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ)۔ یعنی اے پیغمبر! میرے ان بندوں کو بشارت دیدو جو باتوں کو سنتے ہیں اور پھر ان میں جو اچھی بات ہوتی ہے اس کی پیروی کرنے لگتے" ہیں۔ (ایضاً ج ۱۳۔ صفحہ ۳۵۲) حسن بن زیاد لولوی کہتے ہیں کہ" ہمارا یہ قول (فقہ) ایک رائے ہے جو بہتر سے بہتر ہم قائم کر سکتے ہیں۔ جو ہمارے قول سے بہتر رائے لا سکے تو وہی صحت سے زیادہ قریب ہوگی۔" (ایضاً)

ہم نے شروع میں لکھا ہے کہ خود رسول اللہ کے زمانے میں جزئی قوانین باہمی مشاورت سے طے پایا کرتے تھے اور جو معاملات مشورے سے طے پائیں وہ ناقابلِ تغیر و تبدل قرار پا نہیں سکتے۔ اس ضمن میں بغدادی نے لکھا ہے کہ:

محمود بن موسےٰ کہتے ہیں کہ میں نے یوسف بن اسباط سے سنا کہ امام اعظمؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر رسول اللہ مجھے پاتے اور میں آپ کو پاتا تو بہت سی باتوں میں یقیناً آپ میرے قول کو اختیار فرما لیتے۔ اور ابو اسحٰق کو میں نے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ابوحنیفہؒ کے سامنے اکثر نبیؐ کی حدیثیں آتیں اور وہ ان سے اختلاف کرتے۔

(بغدادی۔ جلد ۱۳۔ صفحہ ۲۵۵)

آپ کے اسی مسلک کی تشریح کرتے ہوئے بغدادیؒ نے لکھا ہے:-

ابوعوانہ نے بیان کیا کہ میں ایک روز ابوحنیفہؒ کے پاس بیٹھا تھا کہ سلطان کی طرف سے ایک ایلچی آیا۔ اس نے کہا کہ امیر نے پوچھا ہے کہ ایک آدمی نے شہد کا چھتہ چرا لیا ہے۔ اس کے بارے میں کیا حکم ہے۔ ابوحنیفہؒ نے بلا کسی ہچکچاہٹ کے جواب دیا کہ اس کی قیمت اگر دس درہم ہو تو اس کا ہاتھ کاٹ دو۔ ایلچی چلا گیا تو میں نے ابوحنیفہؒ سے کہا کہ تم خدا سے نہیں ڈرتے۔ رسول اللہ کا ارشاد ہے کہ پھل پھلواری کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جا سکتا۔ خدا اس آدمی کی مدد کو پہنچیے ورنہ امیر کے ہاں اس شخص کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ ابوحنیفہؒ نے بلا کسی ہچکچاہٹ کے کہا کہ وہ حکم گذر چکا اور ختم ہو چکا ہے۔　　(ایضاً۔ صفحہ ۲۹)

امام اعظمؒ کے قول کا آخری ٹکڑا قابلِ غور ہے۔ آپ نے یہ نہیں کہا کہ مجھے اس میں شک ہے کہ وہ ارشاد رسول اللہ کا ہے یا نہیں۔ آپ نے کہا یہ کہ اگر وہ رسول اللہ کا ارشاد تھا تو بھی وہ فیصلہ اس زمانے کے حالات کے مطابق تھا۔ اب حالات بدل چکے ہیں اس لئے اب فیصلہ موجودہ حالات کے مطابق ہونا چاہیئے۔

(۱)

اصولِ قانون سازی کے سلسلے میں جو کچھ علامہ اقبالؒ نے کہا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ ابدی اور غیر متبدل قرآنِ مجید کے احکام، اصول اور اقدار ہیں جنہیں وہ حدود اللہ کہہ کر پکارتا ہے۔ ہر اسلامی مملکت اس کی مجاز ہوتی ہے کہ وہ ان حدود کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق جزئی قوانین اور طریقِ کار خود متعین کرے۔ ایسا کرنے میں وہ سابقہ ادوار کے قوانین سے بطور نظائر استفادہ کر سکتی ہے لیکن وہ ان کی پابندی پر مجبور نہیں ہوتی۔ اس باب میں وہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا ایک قول نقل کرتے ہیں جو بڑا بصیرت افروز ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور انہیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور خمیر

استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں، لیکن ان اصولوں کا نفاذ اُس قوم کی عادات و خصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریقِ کار کی رُو سے رسول کے احکام اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں۔ اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی، انہیں آنے والی نسلوں پر من وعن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ (خطبات۔ تشکیلِ جدید۔ چھٹا خطبہ)

اگر تشکیلِ پاکستان کے بعد علامہ اقبالؒ زندہ رہتے تو وہ اسی اصول کے مطابق قوانین مرتب فرماتے اور اس طرح صدرِ اول کے بعد ایک بار پھر مسلمانوں کی ایک مملکت کو صحیح معنوں میں اسلامی بنا دیتے۔ لیکن ہماری بدقسمتی کہ وہ اس سے بہت پہلے دنیا سے تشریف لے گئے اور اسلامی قوانین کے جس نظریہ اور مسلک کے خلاف انہوں نے اس قدر جہاد کیا تھا وہ یہاں غالب آگیا۔ اور اس خطۂ زمین کو اسلامی مملکت بنانے کا جو حسین خواب اقبالؒ نے دیکھا تھا، وہ خوابِ پریشاں بن کر رہ گیا۔

(۲)

لیکن اس خوابِ پریشاں کو اب بھی عملی حقیقت بنایا جا سکتا ہے۔ اگر ملک میں ایسے اربابِ دانش و بینش ہیں جو اسے عملی حقیقت بنانے کے آرزومند ہیں۔ تو وہ ان گذارشات سے راہ نمائی حاصل کر سکتے ہیں۔

جیسا کہ دیکھا جا چکا ہے۔ اسلامی حکومت کی عمارت دو ستونوں پر استوار ہوتی ہے:۔

(۱) مملکت کا تمام کاروبار قرآن کریم کے مطابق سرانجام پائے گا۔ اور

(۲) اس کے عملی طریق اُمّت کے باہمی مشورہ سے طے پائیں گے۔

قرآن کریم نے مشاورت کا حکم تو دیا ہے لیکن اس کی مشینری خود وضع نہیں کی۔ اسے اُمّت کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ جب یہ مملکت پہلے پہل قائم ہوئی تھی تو اس امر کے فیصلہ کے لئے کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ اس لئے کہ اُس وقت پہلے وہ جماعت (مومنین) تیار کی گئی تھی جس کے ہاتھوں اس حکومت کا کاروبار سرانجام پانا تھا۔ وہ افراد، دل اور دماغ (سیرت اور فکر) دونوں اعتبار سے اس فریضہ کی ادائیگی کے اہل تھے۔ لیکن ہم نے جس قوم میں اس حکومت کی بنیاد رکھنی ہے، وہ تو ویسی نہیں۔ اس لئے اس میں اربابِ مشاورت کے انتخاب کے لئے معیار ہمیں خود متعین کرنا ہوگا۔ اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ:

(۱) ان ارکان میں، عصرِ حاضر کے تقاضوں کو سمجھنے کی صلاحیت ہو۔

(۲) یہ جاننے کی صلاحیت بھی کہ قرآن کریم ان تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کیا راہ نمائی دیتا ہے۔ قدامت پرستانہ قرآن فہمی سے یہ بات حاصل نہیں ہو سکے گی۔ ایسے حضرات کو اس میں شریک نہ کیا جائے۔

(۳) یہ فیصلہ کرنے کی استعداد کہ ان دونوں کی روشنی میں، مملکت کا آئین اور ملک کے قوانین کس قسم کے وضع کئے جائیں۔ (قانون سازی کے سلسلہ میں سابقہ صفحات میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے)۔ اور

(۴) ان کے ماضی کے متعلق کم از کم اتنی پڑتال کر لی جائے کہ وہ ایسا نہ ہو جس سے لوگوں کے دل میں ان کے خلاف نفرت پیدا ہو اور ان پر اعتماد نہ کیا جا سکے۔

(۵) حکومت انہیں معاش کی طرف سے بے فکر کر دے تاکہ وہ اپنا پورا وقت مملکتی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے وقف کر سکیں۔

اس مجلسِ مشاورت کی شکل (عصرِ حاضر کی سیاست کی رُو سے) پارلیمانی ہو یا صدارتی۔ وہ ایک مکانی ہو یا دو مکانی۔ اس کی مدتِ حیات کس قدر ہو وغیرہ وغیرہ۔ ان امور کے متعلق قرآن خاموش ہے۔ اس لئے انہیں، ہم خود طے کر سکتے ہیں۔

یہ مجلس اپنے میں سے بہترین فرد کو سربراہِ مملکت کی حیثیت سے منتخب کر لے۔ اس کی شرائط بھی خود طے کی جا سکتی ہیں۔ ان میں بنیادی شرط یہ ہوگی کہ وہ کسی وقت بھی مشاورت سے بے نیاز ہو کر خود مختار نہ ہو سکے۔

چونکہ مجلسِ مقننہ ہو یا سربراہِ مملکت، ان میں سے کوئی بھی قرآنی حدود سے تجاوز نہیں کر سکے گا، نہ ہی کوئی ایسا قانون وضع اور نافذ ہو سکے گا جو ان حدود سے ٹکرائے، اس لئے اس ادارہ یا سربراہِ مملکت سے متعلق شرائط اور حدود کو چنداں اہمیت حاصل نہیں ہوگی۔ موجودہ (سیکولر) سیاست میں ان کی اہمیت اس لئے ہوتی ہے کہ انہیں بلا حدود و قیود قانون سازی کے کلی اختیارات حاصل ہوتے ہیں اور وہ اپنے سے اوپر کسی اتھارٹی کے سامنے جواب دہ نہیں ہوتے۔ غور سے دیکھئے تو اسلامی مملکت کی پارلیمان، اعیانِ حکومت یا سربراہِ مملکت کو کوئی اختیار حاصل ہی نہیں ہوتا۔ وہ صرف قرآنی احکام کے نافذ کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔

ان تصریحات سے یہ واضح ہے کہ اسلامی مملکت میں اس امر کا فیصلہ کرنا ضروری ہوگا کہ مملکت کا کوئی اقدام قرآنی حدود (اس کے احکام۔ قوانین۔ اصول۔ اقدار) کے خلاف تو نہیں جاتا۔ اسلامی مملکت کی عمارت میں یہی بنیادی اینٹ ہے۔ صدرِ اوّل کی مملکت میں تو اس باب میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ وہاں تو ایک عام بڑھیا تک بھی جانتی تھی کہ معاملہ زیرِ نظر میں قرآن کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسے اس کی جرأت بھی حاصل تھی (اور سربراہِ مملکت کو اسے سننے کی ہمت بھی) کہ وہ قرآنی حدود سے تجاوز کر جانے والی تجویز کو برملا ٹوک سکے۔ لیکن ہمارے موجودہ حالات تو ایسے نہیں۔ ان میں ضروری ہے کہ سپریم کورٹ کی قسم کا کوئی ایسا ادارہ ہو جو ہر زیرِ بحث یا زیرِ عمل آنے والے معاملہ کے متعلق کہہ سکے کہ وہ قرآن کے خلاف تو نہیں۔ اور اس کے فیصلہ کو فوقیت حاصل ہو۔ کہا جائے گا کہ یہ تو تھیا کریسی ہی کی ایک شکل ہو جائے گی۔ لیکن ایسا سمجھنا صحیح نہیں۔ تھیا کریسی میں مذہبی پیشوائیت، انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو غیر متبدل اسلامی احکام قرار دے کر انہیں نافذ کرتی (یا کراتی) ہے۔ جس ادارہ کی تجویز ہم نے پیش کی ہے وہ نہ تو مذہبی پیشوائیت پر مشتمل ہوگا۔ اور نہ ہی وہ خارج از قرآن کسی فیصلہ کو خدائی فیصلہ قرار دے گا۔ وہ ان اربابِ علم و بصیرت پر مشتمل ہوگا جن کی، قرآنی احکام و حقائقِ زمانہ پر گہری نظر ہو۔ وہ اپنی رائے کو قرآنی اسناد اور علمی دلائل کی رُو سے پیش کریں گے۔ صدرِ اوّل کی مملکت میں اس قسم کا ادارہ تو کوئی نہیں تھا، کیونکہ اس کی ضرورت ہی نہ تھی۔ لیکن امورِ مملکت کے فیصلے اسی اصول کے

مطابق ہوتے تھے۔ اس ضمن میں عہدِ فاروقی میں عراق کی زمینوں کا مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ امیرالمؤمنین کی رائے تھی کہ ان زمینوں کو مملکت کی تحویل میں رکھا جائے۔ بعض صحابہؓ کو اس سے اختلاف تھا۔ اس مسئلہ پر مجلسِ مشاورت میں جو تقاریر ہوئی ہیں ان سے ہویدا ہے کہ اختلافی معاملات میں اظہارِ خیالات کی کس قدر آزادی تھی ـــــ حضرت عمرؓ نے اپنی تجویز کو پیش کرتے ہوئے فرمایا تھا:۔

میں نے آپ حضرات کو اس لئے دعوت دی ہے کہ جس بارِ امانت کو آپ نے میرے سر پر رکھا ہے اس کی ادائیگی میں آپ میری اعانت فرمائیں۔ اس وقت مجلس میں میری حیثیت خلیفہ کی نہیں، بلکہ آپ میں سے ایک فرد کی سی ہے۔ اس لئے آپ میں سے ہر شخص کو اپنی رائے آزادی سے پیش کرنے کا حق حاصل ہے۔ ..... میں ہرگز نہیں چاہتا کہ آپ حضرات میری مرضی کا اتباع کریں اور جسے آپ حق سمجھتے ہیں اسے میری خاطر چھوڑ دیں۔ میں آپ کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جسے میں حق سمجھتا ہوں۔ لیکن حق کا معیار نہ آپ کی رائے ہے نہ میری۔ حق کا معیار خدا کی کتاب ہے۔ اور یہ کتاب جس طرح میرے پاس موجود ہے، اسی طرح آپ کے پاس بھی ہے۔ یہی ناطقِ بالحق ہے۔ آپ اسے سامنے رکھ کر جواب دیں کہ اس باب میں اس کا فیصلہ کیا ہے۔ اس پر عمل کرنا ہم سب کا فرض ہوگا۔

(شاہکار رسالت ـــ صفحہ ۳۸۵)

اس کے بعد، قرآن مجید پر غور و فکر کے لئے بحث کو ملتوی کر دیا گیا۔ جب دوبارہ اجلاس شروع ہوا، تو آپ نے کہا کہ للہ الحمد کہ قرآن پر گہری سوچ کے بعد مجھے وہ آیت مل گئی ہے جو اس باب میں قولِ فیصل ہے۔ آپ نے اسے پیش کیا تو سب نے اسے تسلیم کر لیا۔ اور اس کے مطابق فیصلہ ہوا (کہ یہ زمینیں مملکت کی تحویل میں رہیں گی)۔

یہ تھا وہ طریق جس کے مطابق اسلامی مملکت میں اختلافی امور کے فیصلے ہوتے تھے۔ اس میں قولِ فیصل خدا کی کتاب ہوتی تھی، نہ کہ کسی کی رائے۔ حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ کسی معاملہ میں رائے دی تو کسی نے کہا کہ "یہ اللہ اور عمرؓ کی رائے ہے"۔ آپ نے اسے فوراً ڈانٹا اور فرمایا کہ "تو نے یہ بہت بڑی بات کہہ دی ہے۔ یہ صرف عمرؓ کی رائے ہے۔ اگر درست ہے تو اللہ کی طرف سے ہے۔ اور غلط ہے تو عمرؓ کی طرف سے"۔ اس کے بعد تھوڑی دیر خاموش رہے۔ پھر فرمایا کہ "یاد رکھو! رائے غلط بھی ہو سکتی ہے۔ اسے اُمت کے لئے سنت مت بناؤ"۔ (شاہکار رسالت۔ صـ۲۷۵)

یہ تھا وہ طریق جس کے مطابق اس دور میں معاملات کے فیصلے ہوتے تھے۔ ہم نے جو ایک ادارہ کی تجویز پیش کی ہے تو اس لئے نہیں کہ اس کی رائے کو قولِ فیصل قرار دے دیا جائے۔ بلکہ اس لئے کہ وہ قرآن کا فیصلہ سامنے لا سکے۔ جب افرادِ اُمت کو ایسی قرآنی بصیرت حاصل ہو جائے جیسی صدرِ اوّل کے افرادِ اُمت کو حاصل تھی تو پھر اس قسم کے الگ اداروں کی ضرورت نہیں رہے گی۔

(۰)

یہ ہیں اسلامی نظامِ حکومت کے بنیادی خط و خال، قرآن کی روشنی میں۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس قسم کی حکومت کی داغ بیل ڈالنے کے لئے بھی بڑی جرأت اور ہمت کی ضرورت ہوگی۔ جس مملکت میں نہ مذہبی فرقوں کا وجود باقی رہے، نہ ان کی فقہ کا۔ جس میں پرسنل لاز اور پبلک لاز کی کوئی تفریق و تخصیص نہ ہو، اور قوانینِ مملکت کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہو۔ جس میں نہ کسی کے پاس دولت کے انبار جمع ہوں، نہ لامحدود اراضی کے رقبات۔ مختصر الفاظ میں، جس مملکت میں نہ کوئی فرعون ہو، نہ ہامان، نہ قارون، اس کی بنیاد رکھنے کے لئے کس قدر جرأتِ ایمانی کی ضرورت ہوگی، یہ ظاہر ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ مملکت تدریج اپنے منتہیٰ تک پہنچے گی لیکن اس منتہیٰ (منزل) تک لے جانے والے راستہ میں بھی پھولوں کی گلگشت نہیں ہوگی۔ کانٹوں کی آبلہ پائی ہوگی۔ اسی لئے، علامہ اقبالؒ نے اس مملکت کا تصور پیش کرنے کے بعد کہا تھا کہ اس کی ابتدا وہی کر سکے گا جو عمرؓ کی سی جرأت کے ساتھ کہہ سکے کہ

"حسبنا کتاب اللہ"

لیکن اگر کسی میں اس کی ہمت نہ ہو، تو ہم بصد ادب گذارش کریں گے کہ وہ جس قسم کی جی چاہے حکومت قائم کرے لیکن اسے اسلامی حکومت نہ کہا جائے۔ اسے مسلمانوں کی حکومت کہا جائے۔ مسلمانوں کی حکومتوں کو اسلامی حکومتیں کہہ کر ہم اسلام کو کافی نقصان پہنچا چکے ہیں۔ اس سلسلہ کو کہیں تو ختم ہونا چاہیئے!

اگر علامہ اقبالؒ یا قائدِ اعظمؒ زندہ ہوتے تو وہ اس قسم کی حکومت کی داغ بیل ڈال سکتے تھے۔ اقبالؒ کے نظریات تو آپ کے سامنے آچکے ہیں۔ قائدِ اعظمؒ کے ذہن میں اسلامی حکومت کا تصور کس قدر روشن اور بالغ آمیز تھا اس کا اندازہ ان کے ان الفاظ سے لگ سکتا ہے جو انہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی (حیدر آباد۔ دکن) کے طلبا کے اس سوال کے جواب میں ارشاد فرمائے تھے۔ اسلامی حکومت کی خصوصیت کیا ہوگی؟ آپ نے فرمایا تھا:-

> اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے، نہ کسی پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

وہ بار بار اعلان کر چکے تھے کہ "پاکستان میں کسی صورت میں تھیاکریسی نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعمِ خویش) خدائی مشن کو پورا کریں"۔ اس کے ساتھ ہی ان کے حسنِ کردار کی بنا پر قوم کو ان پر ایسا اعتماد تھا کہ ان کے پیش کردہ آئینِ مملکت کی کوئی بھی مخالفت نہ کرتا۔ لیکن وہ اگر نہیں رہے تو کوئی بات نہیں۔ وہ کوئی مامور من اللہ نہیں تھے۔ انسان ہی تھے۔ اور اس قسم کے انسان پھر بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔

(۰)

طلوعِ اسلام کا مقصد و مسلک

(جسے معلوماتِ عامہ کے لئے وقتاً فوقتاً شائع کیا جاتا ہے۔)

(۱) تنہا عقلِ انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت نہیں کر سکتی۔ اسے اپنے رہنمائی کے لئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی ضرورت۔

(۲) خدا کی طرف سے عطا شدہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے ابد تک ضابطۂ ہدایت ہے۔ لہٰذا اب نہ خدا کی طرف سے کسی کو وحی مل سکتی ہے نہ کوئی نبی یا رسول آ سکتا ہے۔ قرآن کریم خدا کی آخری کتاب اور حضورؐ رسالتمآب خدا کے آخری نبی اور رسول ہیں۔

(۳) قرآنِ کریم کا ہر دعویٰ علم پر مبنی ہے اور اس کے حقائق زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہیں۔ قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ جس حد تک انسانی علم ترقی کر چکا ہے وہ انسان کے سامنے ہو اور چونکہ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ خدا نے تمام کائنات انسان کے لئے تابع تسخیر کر رکھی ہے اس لئے خدائی پروگرام کو پورا کرنے

(۴) کے لئے کائناتی قوتوں کی تسخیر ضروری ہے۔

نبی اکرمؐ کی سیرتِ مقدسہ، شرف و عظمتِ انسانیت کی معراجِ کبریٰ ہے۔ یہی وہ پاکیزہ سیرت ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) ہے۔ حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کا جو حصہ قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی یا یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن سے باہر ہے۔ سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضورؐ پر (معاذ اللہ) کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو ہمارے نزدیک وہ بات غلط ہے۔ اسے حضورؐ کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہیئے۔ یہی اصول صحابہ کبارؓ کی سیرتِ مقدسہ کے سلسلہ میں بھی سامنے رکھا جانا چاہیئے۔

(۵) دین کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں کو دوسرے انسانوں کی محکومی سے چھڑا کر ان سے خالص قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرائے۔ قوانین کی یہ اطاعت ایک نظامِ مملکت کی رو سے ہو سکتی ہے اس کے بغیر دین (جو نظامِ زندگی کا نام ہے) متمکن نہیں ہو سکتا۔

(۶) رسول اللہؐ نے سب سے پہلے دین کا نظام قائم فرمایا۔ اس نظام میں قرآنِ کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت کرائی جاتی تھی اور جن امور میں قرآنِ کریم نے صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے امورِ مملکت مسلمانوں کے مشورہ سے سرانجام پاتے تھے۔

(۷) رسول اللہؐ کے بعد دین کا وہی نظام حضورؐ کے خلفائے راشدین نے جاری رکھا۔ اس میں امورِ مملکت سرانجام پانے کا وہی طریقہ تھا جو رسول اللہؐ کے زمانہ میں رائج تھا۔ یعنی قرآنِ کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت اور جن امور میں قرآنِ کریم نے

طرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر اُمت کے مشورہ سے متعلقہ امور کے فیصلے۔ اس طریق کو خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کہا جاتا ہے۔

(۸) بدقسمتی سے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہو گیا اور دین کا نظام باقی نہ رہا۔ اس سے اُمت میں انتشار پیدا ہو گیا۔ خلافت کے زمانے میں تمام امور، دین کے نظام کے تابع رہتے تھے۔ لیکن اب مذہب اور سیاست میں ثنویت پیدا ہو گئی۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری ہے۔

(۹) ہمارے لئے کام کرنے کا یہ ہے کہ پھر سے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کا سلسلہ قائم کیا جائے جو اُمت کو احکام قوانینِ خداوندی کے مطابق چلائے۔ ظاہر ہے کہ اس نظام کو چلانے والوں کی اپنی زندگی سب سے پہلے قوانینِ خداوندی کے تابع ہوگی۔

(۱۰) چونکہ دین کا نظام (خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہوگا۔ اس لئے اس میں موجودہ ثنویت ختم ہو جائے گی۔ یعنی اس میں یہ نہیں ہوگا کہ سیاسی معاملات کے لئے حکومت کی طرف رجوع کیا جائے اور مذہبی یا شخصی امور کیلئے مذہبی پیشوائیت کی طرف۔ اس میں یہ دونوں شعبے باہمدگر مدغم ہو جائیں گے۔

(۱۱) جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہو جاتا، اُمت کے مختلف فرقے جس جس طریق پر نماز، روزہ وغیرہ اسلامی احکام پر عمل کر رہے ہیں، کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ان میں کوئی ردّ و بدل کرے یا کوئی نیا طریقہ وضع کر کے اُسے "خدا اور رسول" کا طریقہ قرار دے۔

(۱۲) قرآنی نظام کا مقصود یہ ہے کہ خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار کے مطابق انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ نظام تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی، روٹی، کپڑا، مکان، علاج، تعلیم وغیرہ بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہو۔

(۱۳) قرآن کا نظام اپنی نوعیت کا واحد اور منفرد نظام ہے اس لئے نہ وہ دنیا کے کسی اور نظام میں جذب ہو سکتا ہے نہ ان سے مفاہمت کر سکتا۔ خواہ وہ مغرب کا جمہوری سرمایہ دارانہ نظام ہو یا سوشلزم کا آمرانہ اشتراکی نظام۔ اس کے نزدیک یہ سب نظام ہائے زندگی غیر خداوندی ہیں لہٰذا باطل۔

(۱۴) جہاں تک احادیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآنِ کریم کے مطابق ہو، یا جس سے حضور نبی اکرمؐ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

(۱۵) ہم، رسول اللہؐ کے بعد، ہر قسم کے مدعیٔ وحی کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔

(۱۶) طلوعِ اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ مذہبی فرقہ سے (اسے فرقۂ اہلِ قرآن سے بھی کوئی تعلق نہیں)۔ نہ ہی یہ کوئی نیا فرقہ پیدا کرنا چاہتا ہے اس لئے کہ اس کے نزدیک دین میں فرقہ سازی شرک ہے۔ اُمت کے مختلف فرقے جس طریق سے نماز، روزہ وغیرہ کی ادائیگی کرتے ہیں، ہم ان میں کسی قسم کا ردّ و بدل نہیں کرتے۔ اور بلا ردّ و بدل ان کی پابندی کرتے ہیں۔ ہم قرآنِ کریم کی تعلیم کو عام کرتے ہیں تاکہ کسی طرح پھر سے قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) کا قیام عمل میں آسکے۔ یہ ہے ہمارا مسلک، جسے ہم برسوں سے دہراتے چلے آرہے ہیں۔ اس کے خلاف جو کچھ ہماری طرف منسوب کیا جاتا ہے، وہ مخالفین کا گمراہ کن پروپیگنڈہ ہے۔

(٥)

ادارۂ طلوعِ اسلام کی مطبوعات کی قیمتیں

(مارچ ۱۹۸۲ء)

نوٹ:- اِن قیمتوں میں ڈاک اور پیکنگ کا خرچ شامل نہیں۔

نام کتاب	قیمت
مفہوم القرآن (مکمل سیٹ کھلے پارے)	۱۵۰/- روپے
پارہ نمبر ۱ و ۳۰ (فی پارہ)	۶/-
پارہ نمبر ۲ تا ۲۹ (")	۵/-
مفہوم القرآن (مکمل سیٹ۔ مجلد)	۱۸۰/-
(تین جلدوں میں) فی جلد	۶۰/-
لغات القرآن (مکمل سیٹ۔ مجلد)	۲۰۰/-
(چار جلدوں میں) فی جلد	۵۰/-
تبویب القرآن (مکمل سیٹ مجلد)	۲۰۰/-
مطالب الفرقان (جلد اوّل)	۶۰/-
مطالب الفرقان (جلد دوم) (پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا ہے۔ دوسرا ایڈیشن زیرِ طبع ہے)۔	
مطالب الفرقان (جلد سوم)	۷۵/-
مطالب الفرقان (جلد چہارم)	۹۰/-
تصوّف کی حقیقت	۷۵/-
نظامِ ربوبیت (جدید ایڈیشن)	۵۰/-
قرآنی قوانین (جدید ایڈیشن)	۲۵/-

نام کتاب	قیمت
جوئے نور	۳۵/- روپے
شعلۂ مستور	۳۵/-
جہانِ فردا	۳۵/-
کتاب التقدیر	۳۵/-
معراجِ انسانیت	۶۰/-
شاہکارِ رسالت (تازہ ایڈیشن)	۷۵/-
اقبالؒ اور قرآن	۳۵/-
انسان نے کیا سوچا؟	۵۰/-
مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں	۱۵/-
حسنِ کردار کا نقشِ تابندہ (اعلیٰ ایڈیشن)	۱۰/-
ISLAM A CHALLENGE TO RELIGION (H.B)	۵۵/-
(P.B)	۴۵/-
سلسبیل	۲۰/-
فردوسِ گم گشتہ	۲۰/-
ختمِ نبوت اور تحریکِ احمدیت (مجلد)	۱۵/-

نام کتاب	قیمت
سلیم کے نام خطوط (جلد اوّل)	۲۵/- روپے
(جلد دوم و سوم) فی جلد	۱۵/-
طاہرہ کے نام خطوط	۱۰/-
مقامِ حدیث	۱۰/-
اسلامی معاشرت	۶/-
قرآنی فیصلے (مکمل ۴ جلدیں)	۴۵/-
(پہلی تین جلدیں، ہر جلد -/۱۰ روپے)	
(چوتھی جلد -/۱۵ روپے)	
اسبابِ زوالِ اُمّت	۵/-
عربی خود سیکھئے	۱۰/-
پاکستان کا معمارِ اوّل	۵/-
فجر الاسلام (مکمل دو جلدیں۔ فی جلد -/۸)	۱۶/-
منزل بہ منزل	۱۵/-
پرنسپل آف لا میکنگ اِن اسلام (انگریزی)	۵/-
قائدِ اعظمؒ اور طلوعِ اسلام	۴/-

نام کتاب	قیمت
قتلِ مرتد اور غلام اور لونڈیاں	۵/- روپے
تاریخ الامّت (مکمل سیٹ ۸ جلدیں)	۴۰/-
حسبِ ذیل کتب کا سابقہ ایڈیشن ختم ہو گیا ہے۔ تازہ ایڈیشن چھپنے پر اعلان کیا جائیگا	
ابلیس و آدم۔ من و یزداں۔ برقِ طور۔	
اسلام کیا ہے؟۔ جہاد۔ بہائیزم۔	
الفتنۃ الکبریٰ۔	
تصنیفات (انگریزی)	
ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب:۔	
PHENOMENA OF -- NATURE & QURAN (H.B)	۵۰/-
CONSPIRACIES -- AGAINST QURAN (H.B)	۴۰/-
FOOD & HYGIENE -- IN ISLAM (P.B)	۸/-

ماہنامہ طلوعِ اسلام کا سالانہ چندہ:۔

اندرونِ ملک پاکستان ... -/۱۳۶ روپے
غیر ممالک بذریعہ بحری ڈاک رجسٹرڈ -/۸۶ "
غیر ممالک بذریعہ ہوائی ڈاک رجسٹرڈ:۔

۱۔ یورپ کے ممالک (برطانیہ، فرانس، سوئٹزرلینڈ وغیرہ) ---------- -/۱۳۶ روپے
۲۔ عرب ممالک (دوبئی، بحرین، کویت، سعودی عرب وغیرہ) ---------- -/۱۱۶ "
۳۔ افریقہ کے ممالک (لیبیا، کینیا، یوگنڈا، مصر، جنوبی افریقہ وغیرہ) ---------- -/۱۳۱ "
۴۔ امریکہ، کینیڈا وغیرہ ---- -/۱۹۶ روپے۔ (۵) نیوزی لینڈ، آسٹریلیا، جزائر فجی، وغیرہ ---- -/۱۸۱ "
۶۔ انڈیا، برما، سری لنکا، جزائر مالدیپ، وغیرہ ---- -/۱۲۱ روپے۔ (۷) بنگلہ دیش -/۱۳۶ "

نوٹ:۔ ماہنامہ طلوعِ اسلام کے لئے صرف، ادارہ طلوعِ اسلام کو لکھیئے۔

کتابیں ملنے کے پتے: (۱) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور (۲) مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور